بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

6973

سورۃ النبا (78)

آیت نمبر (1 تا 16)

و	ھ	ج

(ض) وَھۡجًا — آگ یا سورج کا روشن ہونا۔

وَھَّاجٌ — فَعَّالٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔ خوب روشن ہونے والا۔ زیر مطالعہ آیت۔ 13۔

ث	ج	ج

(ن) ثَجۡوۡجًا — پانی کا زور سے بہنا یا برسنا۔

ثَجَّاجٌ — فَعَّالٌ کے وزن پر مبالغہ ہے بہت زور سے بہنے والا یا برسنے والا۔ زیر مطالعہ آیت۔ 14۔

ترجمہ

عَمَّ	یَتَسَآءَلُوۡنَ ﴿۱﴾	عَنِ النَّبَاِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۲﴾	الَّذِیۡ ھُمۡ فِیۡہِ
کس چیز کے بارے میں	یہ لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں	اُس عظیم خبر کے بارے میں؟	وہ، یہ لوگ جس میں

مُخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۳﴾	کَلَّا سَیَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴﴾	ثُمَّ	کَلَّا سَیَعۡلَمُوۡنَ ﴿۵﴾
اختلاف کرنے والے ہیں	ہرگز نہیں! یا یہ لوگ جان لیں گے	پھر (مکرر)	ہرگز نہیں! یہ لوگ جان لیں گے

اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ	مِھٰدًا ﴿۶﴾	وَّ الۡجِبَالَ اَوۡتَادًا ﴿۷﴾
کیا ہم نے نہیں بنایا زمین کو	آرام دہ ٹھکانہ	اور پہاڑوں کو میخیں

وَّ خَلَقۡنٰکُمۡ اَزۡوَاجًا ﴿۸﴾	وَّ جَعَلۡنَا نَوۡمَکُمۡ	سُبَاتًا ﴿۹﴾	وَّ جَعَلۡنَا الَّیۡلَ
اور ہم نے پیدا کیے تم لوگوں کو جوڑے جوڑے	اور ہم نے بنایا تمہاری نیند کو	آرام کے لیے	اور ہم نے بنایا رات کو

لِبَاسًا ﴿۱۰﴾	وَّ جَعَلۡنَا النَّھَارَ	مَعَاشًا ﴿۱۱﴾	وَّ بَنَیۡنَا فَوۡقَکُمۡ
ایک پردہ	اور ہم نے بنایا دن کو	زندگی گزارنے کا وقت	اور ہم نے بنائے تمہارے اوپر

سَبۡعًا شِدَادًا ﴿۱۲﴾	وَّ جَعَلۡنَا سِرَاجًا وَّھَّاجًا ﴿۱۳﴾	وَّ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡمُعۡصِرٰتِ
سات مضبوط (آسمان)	اور ہم نے بنایا ایک بہت روشن چراغ	اور ہم نے اتارا بدلیوں میں سے

مَآءً ثَجَّاجًا ﴿۱۴﴾	لِّنُخۡرِجَ بِہٖ	حَبًّا وَّ نَبَاتًا ﴿۱۵﴾	وَّ جَنّٰتٍ اَلۡفَافًا ﴿۱۶﴾
موسلا دھار پانی	تاکہ ہم نکالیں اس سے	دانے اور سبزہ	اور کچھ گھنے باغات

نوٹ: 1 عَمَّ دراصل دو حرفوں عن اور ما سے مرکب ہے۔ حرف مَا استفہام کے لیے آتا ہے۔ اس ترکیب میں حرف مَا سے الف ساقط کر دیا جاتا ہے۔

6973

معنی ہوئے جس چیز کے بارے میں (معارف القرآن)۔

نوٹ:2 مکہ معظّمہ میں جب اوّل اوّل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اسلام کی تبلیغ کا آغاز کیا تو اس کی بنیاد تین چیزیں تھیں۔ ایک یہ بات کہ اللہ کے ساتھ کسی کو خدائی میں شریک نہ مانا جائے۔ دوسری یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اللہ نے اپنا رسول مقرر کیا ہے۔ تیسری یہ کہ اس دنیا کا ایک روز خاتمہ ہو جائے گا اور اس کے بعد ایک دوسرا عالم برپا ہوگا جس میں تمام اولین و آخرین دوبارہ زندہ کر کے اسی جسم کے ساتھ اٹھائے جائیں گے جس میں رہ کر انہوں نے اس دنیا میں کام کیا تھا۔ پھر ان کے عقائد اور اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ اس محاسبہ میں جو لوگ مومن اور صالح ثابت ہوں گے وہ ہمیشہ کے لیے جنت میں جائیں گے اور جو کافر و فاسق ہوں گے وہ دوزخ میں جائیں گے۔

ان میں سے پہلی بات اگرچہ اہل مکہ کو سخت ناگوار تھی، لیکن بہر حال وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے منکر نہ تھے، اس کے رب اعلیٰ اور خالق و رازق ہونے کو بھی مانتے تھے اور یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ دوسری جن جن ہستیوں کو وہ معبود قرار دیتے ہیں وہ اللہ ہی کی مخلوق ہیں۔ اس لیے جھگڑا صرف اس بات میں تھا کہ خدا کی خدائی میں ان ہستیوں کی کوئی شرکت ہے یا نہیں۔ دوسری بات کو مکہ کے لوگ ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ لیکن اس امر سے انکار کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ چالیس سال تک جو زندگی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کے درمیان گزاری تھی اس میں انہوں نے کبھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جھوٹا یا فریب کار یا مطلبی نہ پایا تھا۔ اس لیے ہزار بہانے اور الزامات تراشنے کے باوجود انہیں دوسروں کو باور کرانے اور خود باور کرنے میں سخت مشکل پیش آ رہی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سارے معاملات میں تو راستباز ہیں اور صرف رسالت کے دعوے میں معاذ اللہ جھوٹے ہیں۔

اس طرح پہلی دو باتیں اہل مکہ کے لیے اتنی زیادہ الجھن کا باعث نہ تھیں جتنی تیسری بات تھی۔ انہوں نے سب سے زیادہ اسی کا مذاق اڑایا، سب سے زیادہ حیرانی اور تعجب کا اظہار کیا اور اسے بالکل بعید از عقل اور ناممکن سمجھ کر جگہ جگہ اس کے ناقابل تصور ہونے کے چرچے شروع کر دیئے۔ مگر ان لوگوں کو اسلام کی راہ پر لانے کے لیے یہ قطعی ناگزیر تھا کہ آخرت کا عقیدہ ان کے ذہن میں اتارا جائے کیونکہ اس عقیدے کو مانے بغیر یہ ممکن ہی نہ تھا کہ حق اور باطل کے معاملہ میں ان کا طرز فکر سنجیدہ ہو سکتا، خیر و شر کے معاملہ میں ان کا معیار بدل سکتا اور دنیا پرستی کی راہ چھوڑ کر اس راہ پر ایک قدم بھی چل سکتے جس پر اسلام ان کو چلانا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ معظّمہ کے ابتدائی دور کی سورتوں میں زیادہ تر زور آخرت کا عقیدہ دلوں میں بٹھانے پر صرف کیا گیا ہے۔ البتہ اس کے لیے دلائل ایسے انداز سے دیئے گئے ہیں جن سے توحید کا تصور بھی خود بخود ذہن نشین ہوتا چلا جاتا ہے اور بیچ بیچ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور قرآن کے برحق ہونے کے دلائل بھی مختصراً دیے گئے ہیں۔ اس لیے اس دور کی سورتوں میں سورۂ قیامہ سے نازعات تک) آخرت کے مضمون کی تکرار زیادہ ہے۔ (تفہیم القرآن۔ ج ۶۔ ص: ۲۲۰۔ ۲۲۱)

نوٹ:3 آیت۔9۔ میں حق تعالیٰ نے انسان کی راحت کے سب سامانوں میں سے خاص طور پر نیند کا ذکر فرمایا ہے۔ غور کیجئے تو یہ ایک عظیم الشان نعمت ہے۔ اور اس نعمت کو حق تعالیٰ نے پوری مخلوق کے لیے ایسا عام فرما دیا ہے کہ امیر، غریب، عالم، جاہل، بادشاہ اور مزدور سب کو یہ دولت بیک وقت عطا ہوتی ہے۔ بلکہ دنیا کے حالات کا تجزیہ کریں تو غریبوں اور محنت کشوں کو یہ نعمت جیسی حاصل ہوتی ہے وہ مالداروں اور دنیا کے بڑوں کو نصیب نہیں ہوتی۔ نیند کی نعمت گدوں، تکیوں یا کوٹھی بنگلوں کی فضا کے تابع نہیں ہے، یہ تو حق تعالیٰ کی ایک نعمت ہے جو براہِ راست اس کی طرف سے ملتی ہے۔ بعض اوقات مفلس کو بغیر کسی بستر تکیے کے، کھلی زمین پر یہ نعمت فراوانی سے دے دی جاتی

6973
ہے اور بعض اوقات ساز وسامان والوں کو نہیں دی جاتی، ان کو خواب آور گولیاں کھا کر حاصل ہوتی ہے اور بعض اوقات وہ گولیاں بھی کام نہیں کرتیں۔ پھر غور کرو کہ حق تعالیٰ نے ساری مخلوق کو یہ نعمت مفت اور بلا محنت دی ہے۔ پھر اس سے بڑی نعمت یہ ہے کہ اس نے اپنی رحمت کاملہ سے اس نعمت کو جبری بنا دیا ہے۔ انسان بعض اوقات کام کی کثرت سے مجبور ہو کر چاہتا ہے کہ رات بھر جاگتا رہے مگر رحمت حق اس پر جبراً نیند مسلط کر کے اس کو سلا دیتی ہے کہ دن بھر کی تھکان دور ہو جائے اور اس کے قویٰ مزید کام کے لیے تیز ہو جائیں۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:4 آیت۔13۔ میں روشن چراغ سے مراد سورج ہے۔ اس مختصر سے فقرے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت کے جس عظیم الشان نشان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کا قطر زمین کے قطر سے ۱۰۹ گنا اور حجم زمین کے حجم سے ۱۳ لاکھ ۳۳ ہزار گنا زیادہ بڑا ہے۔ اس کا درجۂ حرارت ایک کروڑ چالیس لاکھ ڈگری سنٹی گریڈ ہے۔ زمین سے ۹ کروڑ تیس لاکھ میل دور ہونے کے باوجود اس کی روشنی کا یہ حال ہے کہ انسان اگر برہنہ آنکھ سے اس کی طرف نظر جمانے کی کوشش کرے تو اپنی بینائی کھو بیٹھے۔ یہ اللہ ہی کی حکمت ہے کہ اس نے زمین کو اس سے ٹھیک اتنے فاصلے پر رکھا ہے کہ نہ اس سے بہت قریب ہونے کے باعث اتنا گرم ہے اور نہ بہت دور ہونے کے باعث بے انتہا سرد۔ اسی وجہ سے یہاں انسان، حیوان اور نباتات کی زندگی ممکن ہوئی ہے۔ اسی سے قوت کے بے حساب خزانے نکل کر زمین پر پہنچ رہے ہیں۔ اسی سے فصلیں پک رہی ہیں اور ہر مخلوق کو غذا پہنچ رہی ہے۔ اسی کی حرارت سمندروں کے پانی کو گرم کر کے وہ بھاپیں اٹھاتی ہے جو ہواؤں کے ذریعہ سے زمین کے مختلف حصوں میں پھیلی اور بارش کی شکل میں برستی ہیں۔ اس سورج میں اللہ تعالیٰ نے ایسی زبردست بھٹی سلگا رکھی ہے جو اربوں سال سے روشنی، حرارت اور مختلف اقسام کی شعاعیں سارے نظام شمسی میں پھینکے جا رہی ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

آیت نمبر (17 تا 30)

اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ	كَانَ مِيْقَاتًا ﴿۱۷﴾	يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ	فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ﴿۱۸﴾
یقیناً فیصلے کا دن	ہے ایک طے شدہ وقت	جس دن پھونکا جائے گا صور میں	تو تم لوگ آؤ گے فوج در فوج
وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ	فَكَانَتْ اَبْوَابًا ﴿۱۹﴾	وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ	فَكَانَتْ سَرَابًا ﴿۲۰﴾
اور کھولا جائے گا آسمان	تو وہ ہو گا دروازے دروازے	اور چلایا جائے گا پہاڑوں کو	تو وہ ہوں گے چمکتی ریت

اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ﴿۲۱﴾	لِّلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا ﴿۲۲﴾	لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ﴿۲۳﴾
بیشک جہنم ہے گھات لگانے کا مستقل ٹھکانہ	سرکشی کرنے والوں کے لیے واپس ہونے کی جگہ ہوتے ہوئے	رہنے والے ہوتے ہوئے اس میں مدتوں
لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا	بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ﴿۲۴﴾	اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ﴿۲۵﴾
وہ لوگ نہیں چکھیں گے اس میں	کوئی ٹھنڈک اور نہ کوئی پینے کی چیز	سوائے گرام پانی اور پیپ کے
جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿۲۶﴾	اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ﴿۲۷﴾	وَّكَذَّبُوْا
جیسے کا تیسا بدلہ ہوتے ہوئے	بیشک یہ لوگ توقع نہیں کیا کرتے تھے کسی محاسبہ کی	اور انہوں نے جھٹلایا ہماری نشانیوں کو

بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ﴿۲۸﴾	وَكُلَّ شَيْءٍ	اَحْصَيْنٰهُ	كِتٰبًا ﴿۲۹﴾
بہت زیادہ جھٹلاتے ہوئے	اور ہر چیز کو	ہم نے احاطہ کیا اس کا	بطور لکھی ہوئی ہونے کے

فَذُوْقُوْا	فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ	اِلَّا عَذَابًا ؏ ۳۰ 6973
پس تم لوگ چکھو	تو ہم ہرگز زیادہ نہیں کریں گے تم کو	مگر بلحاظ عذاب کے

نوٹ:1

يَوْمَ الْفَصْلِ سے مراد قیامت ہے۔ وہ ایک وقت اور متعین حد ہے جس پر یہ دنیا ختم ہو جائے گی جبکہ صور پھنکا جائے گا۔ اور دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ نفخ صور دو مرتبہ ہوگا۔ پہلے نفخہ سے سارا عالم فنا ہو جائے گا اور دوسرے نفخہ سے پھر زندہ و قائم ہو جائے گا۔ اس دوسرے نفخہ کے وقت سارے عالم کے اگلے پچھلے انسان اپنے رب کے سامنے فوج در فوج ہو کر حاضر ہوں گے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ لوگ قیامت کے روز تین فوجوں میں تقسیم ہوں گے۔ ایک فوج ان لوگوں کی ہوگی جو پیٹ بھرے ہوئے لباس پہنے ہوئے سواریوں پر سوار میدان حشر میں آئیں گے، دوسری فوج پیادہ لوگوں کی ہوگی جو چل کر میدان میں آئیں گے اور تیسری فوج ان لوگوں کی ہوگی جن کو چہروں کے بل گھسیٹ کر میدان حشر میں لایا جائے گا۔ بعض روایات میں افواج کی تشریح دس قسم کی افواج سے کی گئی ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ حاضرین محشر کی بے شمار جماعتیں اپنے اپنے اعمال کے اعتبار سے ہوں گی۔ ان اقوال میں کوئی تضاد نہیں، سب جمع ہو سکتے ہیں، (معارف القرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔23۔ میں ہے کہ وہ لوگ اس میں مدتوں رہنے والے ہیں۔ مدتوں کے لیے لفظ احقاب استعمال کیا گیا ہے (یہ جمع الجمع ہے۔ اس کا واحد حُقُبٌ ہے۔ اس کی جمع حُقُبٌ ہے اور اس کی جمع اَحْقَابٌ ہے۔ مرتب) جس کے معنی ہیں پے در پے آنے والے طویل زمانے۔ اس لفظ سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کرنے کی کوشش کی ہے کہ جنت کی زندگی میں تو ہمیشگی ہوگی مگر جہنم میں ہمیشگی نہیں ہوگی کیونکہ یہ مدتیں خواہ کتنی ہی طویل ہوں لیکن بہرحال کبھی نہ کبھی جا کر ختم ہو جائیں گی۔ لیکن یہ استدلال دو وجوہ سے غلط ہے۔ ایک یہ کہ عربی لغت کے لحاظ سے حقب کے لفظ ہی میں یہ مفہوم شامل ہے کہ ایک حقب کے پیچھے دوسرا حقب ہو۔ اس لیے احقاب لازماً ایسے ادوار ہی کے لیے بولا جائے گا جو پے در پے ایک دوسرے کے بعد آتے چلے جائیں اور کوئی دور بھی ایسا نہ ہو جس کے پیچھے دوسرا دور نہ آئے۔ دوسرے یہ کہ کسی موضوع کے متعلق قرآن مجید کی کسی آیت سے کوئی ایسا مفہوم لینا اصولاً غلط ہے جو اسی موضوع کے بارے میں قرآن کے دوسرے بیانات سے متصادم ہو۔ قرآن میں ۳۴ مقامات پر اہل جہنم کے لیے خلود (ہمیشگی) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ایک جگہ صاف صاف ارشاد ہوا ہے کہ وہ چاہیں گے کہ جہنم سے نکل جائیں مگر وہ اس سے ہرگز نکلنے والے نہیں ہیں۔ (المائدۃ۔37) ان تصریحات کے بعد لفظ احقاب کی بنیاد پر یہ کہنے کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ جہنم میں خدا کے باغیوں کا قیام دائمی نہیں ہوگا۔ (تفہیم القرآن)۔

یہ بات اس لیے بھی غلط ہے کہ زبان سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ مجمل کی شرح مفصل کی روشنی میں کرتے ہیں نہ کہ مفصل کی شرح مجمل کی روشنی میں۔ خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا کے الفاظ ظاہر ہے کہ مفصل ہیں اور لفظ اَحْقَابٌ مجمل ہے۔ اس مجمل کو مفصل کی روشنی میں سمجھیں گے نہ کہ اس کے برعکس (تدبر قرآن)۔

آیت نمبر (31 تا 40)

6973

د	ہ	ق

(ف) دِھَقًا — پیالہ بھرنا۔ پانی کوزور سے گرانا۔

دِھَاقٌ — لبالب بھرا ہوا پیالہ۔ زیر مطالعہ آیت۔ 34۔

ترکیب

(آیت۔ 31) مَفَازًا مبتدا مؤخر نکرہ ہے اور اِنَّ کا اسم ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ اس کی خبر محذوف ہے جو مَوْجُوْدٌ ہو سکتی ہے۔ لِلْمُتَّقِيْنَ قائم مقام خبر مقدم ہے۔ (آیت۔ 23 تا 34)۔ ان آیات کے الفاظ سابقہ آیت کے اِنَّ پر عطف ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہیں، (آیت۔ 35)۔ لَغْوًا اور كِذّٰبًا، لَا يَسْمَعُوْنَ کا مفعول ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہیں۔ (آیت۔ 36)۔ جَزَاءً اور عَطَاءً حِسَابًا حال ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہیں۔ (آیت۔ 37) اس آیت میں رَبِّ اور اَلرَّحْمٰنِ، یہ دونوں گزشتہ آیت کے رَبِّكَ کا بدل ہونے کی وجہ سے حالت جر میں ہیں۔ (آیت۔ 40) اَلْمَرْءُ اور اَلْكَافِرُ دونوں پر لام جنس ہے۔

ترجمہ

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ	مَفَازًا ﴿۳۱﴾	حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا ﴿۳۲﴾
یقیناً متقی لوگوں ہی کے لیے	مراد پانے کی ایک جگہ ہے	باغیچے ہیں اور انگور ہیں

وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا ﴿۳۳﴾	وَّكَاْسًا دِهَاقًا ﴿۳۴﴾	لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا
اور نوخیز ہم جولیاں ہیں	اور چھلکتے جام ہیں	وہ لوگ نہیں سنیں گے اس میں

لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ﴿۳۵﴾	جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ	عَطَآءً حِسَابًا ﴿۳۶﴾
کوئی بے سود بات اور نہ کوئی جھوٹ	بدلہ ہوتے ہوئے آپؐ کے رب (کی طرف) سے	حساب کی ہوئی بخشش ہوتے ہوئے

رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	وَمَا بَيْنَهُمَا	الرَّحْمٰنِ
جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے	اور اس کا جو ان دونوں کے درمیان ہے	جو انتہائی رحمت والا ہے

لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ﴿۳۷﴾	يَوْمَ يَقُوْمُ	الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ	صَفًّا
لوگ اختیار نہیں رکھتے اس سے خطاب کرنے کا	جس دن کھڑے ہوں گے	وہ روح (جبریلؑ) اور سارے فرشتے	صف بنائے ہوئے

لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ	اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ	وَقَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾	ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ
لوگ بول نہیں پائیں گے سوائے اس کے	اجازت دے گا جس کے لیے رحمٰن	اور وہ کہے گا بے لاگ بات	یہ ہوگا وہ برحق دن

فَمَنْ شَآءَ	اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ﴿۳۹﴾	اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ
تو (اب) جس کا جی چاہے	وہ بنالے اپنے رب کی طرف واپس ہونے کی ایک جگہ	بیشک ہم نے خبردار کردیا تم لوگوں کو

عَذَابًا قَرِيْبًا	يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ	مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ
ایک قریبی عذاب سے	جس دن دیکھ لے گا ہر آدمی	اس کو جو آگے بھیجا اس کے دونوں ہاتھوں کو

وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ	يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ﴿٤٠﴾ 6973
اور کہے گا ہر کافر	اے کاش میں ہوتا کوئی مٹی

نوٹ:1 آیت۔36۔ کا مطلب یہ ہے کہ اوپر جنت کی جن نعمتوں کا ذکر آیا ہے یہ جزاء ہے مومنین کے لیے اور عطاء ہے ان کے رب کی طرف سے یہاں ان نعمتوں کو پہلے جزائے اعمال بتلایا گیا پھر عطائے ربانی۔ بظاہر ان دونوں میں تضاد ہے۔ جزاء اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز کے بدلے میں ہو۔ اور عطاء وہ ہے جو بلا کسی بدلے کے بطور انعام ہو۔ قرآن کریم نے ان دونوں لفظوں کو ایک جگہ جمع کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ جنت میں داخل ہونا اور اس کی نعمتیں صرف صورت اور ظاہر کے اعتبار سے اہل جنت کے اعمال کی جزاء ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ خالص عطائے ربانی ہے، کیونکہ انسانی اعمال تو ان نعمتوں کا بھی بدلہ نہیں بن سکتے جو ان کو دنیا میں دے دی گئیں۔ اس لیے آخرت میں نعمتوں کا ملنا تو صرف حق تعالیٰ کا انعام اور عطائے محض ہے۔ حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے عمل سے جنت میں نہیں جاسکتا جب تک حق تعالیٰ کا فضل نہ ہو۔ صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا کہ کیا آپ ﷺ بھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں میں بھی اپنے عمل سے جنت میں نہیں جاسکتا۔

لفظ حِسَابًا کے دو معنی کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ ایسی عطاء جو اس کی تمام ضرورتوں کے لیے کافی ہو۔ اور لفظ کے دوسرے معنی حساب کے موازنہ اور مقابلہ کے لیے بھی آتے ہیں۔ اس معنی میں آیت کا مطلب یہ ہوا کہ یہ عطائے ربانی اہل جنت پر ان کے اعمال کے حساب سے مبذول ہوگی۔ اس عطاء میں درجات بحساب اخلاص اور احسانِ عمل کے ہوں گے جیسا کہ احادیث میں صحابۂ کرامؓ کے اعمال کا درجہ باقی امت کے اعمال کے مقابلے میں یہ قرار دیا ہے کہ صحابی اگر اللہ کی راہ میں ایک مد یعنی ایک سیر خرچ کرے اور غیر صحابی اُحد پہاڑ کے برابر خرچ کرے تو صحابی کا ایک مُد اس پہاڑ سے بڑھا ہوا رہے گا۔ (معارف القرآن)

مورخہ ۲۳۔ جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ النّٰزِعٰتِ (79)

آیت نمبر (1 تا 14)

ن ش ط

(ض۔ن) نَشْطًا: گرہ کھولنا۔ گرہ لگانا۔ بند کھولنا۔ زیر مطالعہ آیت۔2۔

نَاشِطَةٌ: اسم الفاعل ہے۔ بند کھولنے والی۔ زیر مطالعہ آیت۔2۔

ن خ ر

(س) نَخَرًا: بوسیدہ ہو کر ریزہ ریزہ ہونا۔

نَخِرَةٌ: صفت ہے۔ ریزہ ریزہ۔ بُھر بُھری۔ زیر مطالعہ آیت۔11۔

س ھ ر

6973

سَهَرًا — رات بھر جاگتے رہنا۔

سَاهِرَةٌ — رات بھر جاگنے والی۔ پھر اس سے مراد لیتے ہیں سطح زمین۔ میدان۔ زیر مطالعہ آیت۔ 14۔

ترجمہ

وَالنّٰزِعٰتِ	غَرْقًا ۝۱	وَّالنّٰشِطٰتِ	نَشْطًا ۝۲
قسم ہے کھینچ نکالنے والیوں کی	ڈوب کر	اور بند کھولنے والیوں کی	جیسے کھولنے کا حق ہے

وَّالسّٰبِحٰتِ	سَبْحًا ۝۳	فَالسّٰبِقٰتِ	سَبْقًا ۝۴	فَالْمُدَبِّرٰتِ
اور تیرنے والیوں کی	جیسے تیرتے ہیں	پھر سبقت کرنے والیوں کی	جیسے سبقت کرتے ہیں	پھر تدبیر کرنے والیوں کی

اَمْرًا ۝۵	يَوْمَ تَرْجُفُ	الرَّاجِفَةُ ۝۶	تَتْبَعُهَا	الرَّادِفَةُ ۝۷
کسی (بھی) حکم کے لیے	جس دن لرزے گی	وہ لرزنے والی	اس کے پیچھے آئے گی	وہ پیچھے لگنے والی

قُلُوْبٌ يَّوْمَىِٕذٍ	وَّاجِفَةٌ ۝۸	اَبْصَارُهَا	خَاشِعَةٌ ۝۹	يَقُوْلُوْنَ
کچھ دل اس دن	مضطرب ہونے والے ہیں	ان کی آنکھیں	جھکنے والی ہیں	وہ لوگ کہتے ہیں

ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ	فِي الْحَافِرَةِ ۝۱۰	ءَاِذَا كُنَّا	عِظَامًا نَّخِرَةً ۝۱۱
کیا بے شک ہم ضرور لوٹائے جانے والے ہیں	اُسی قدم میں (اُلٹے پاؤں)	کیا جب ہم ہو گئے	بُھر بُھری ہڈیاں

قَالُوْا	تِلْكَ اِذًا	كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۝۱۲	فَاِنَّمَا هِيَ
انہوں نے کہا	وہ تو پھر	خسارہ دینے والی باری ہوگی	پھر وہ تو بس

زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝۱۳	فَاِذَا هُمْ	بِالسَّاهِرَةِ ۝۱۴
ایک (ہی) جھڑکی ہوگی	پھر جب ہی وہ لوگ	اُس میدان میں ہوں گے

نوٹ:1

یہاں پانچ اوصاف رکھنے والی ہستیوں کی قسم جس بات پر کھائی گئی ہے اس کی وضاحت نہیں کی گئی لیکن آگے کا مضمون اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ قسم اس بات پر کھائی گئی ہے کہ قیامت ضرور آئے گی اور تمام مرے ہوئے انسان دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔ اس کی وضاحت بھی نہیں کی گئی کہ یہ پانچ اوصاف کن ہستیوں کے ہیں۔ لیکن صحابہ اکرامؓ اور تابعین کی بڑی تعداد کا کہنا ہے کہ اس سے مراد فرشتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ وقوعِ قیامت اور حیات بعد الموت پر فرشتوں کی قسم کیوں کھائی گئی، جبکہ یہ خود بھی اسی طرح غیر محسوس ہیں جس طرح وہ چیز غیر محسوس ہے جس کے واقع ہونے پر ان کو بطور گواہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل عرب فرشتوں کے وجود کے منکر نہ تھے۔ وہ تسلیم کرتے تھے کہ انسان کی جان فرشتے ہی نکالتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ فرشتوں کی حرکت انتہائی تیز ہے۔ اور ہر حکم بلا تاخیر بجالاتے ہیں۔ وہ یہ بھی مانتے تھے کہ فرشتے کائنات کا انتظام اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے چلاتے ہیں، اپنی مرضی کے مالک نہیں ہیں۔ اس لیے یہاں پر استدلال اس بنا پر کیا گیا ہے کہ جب خدا کے حکم سے فرشتے تمہاری جان نکالتے ہیں تو اسی کے حکم سے وہ دوبارہ جان ڈال بھی سکتے ہیں

جب خدا کے حکم سے وہ کائنات کا انتظام چلا رہے ہیں تو اسی حکم سے وہ اس کائنات کو درہم برہم کر کے ایک دوسری دنیا بھی بنا سکتے ہیں۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ: 2 اس جگہ فرشتوں کی پانچ صفات بیان کی گئی ہیں جن کا تعلق انسان کی موت اور روح قبض کرنے سے ہیں مقصد تو قیامت کا حق ہونا بیان کرنا ہے لیکن شروع انسان کی موت اس کے لیے ایک جزوی قیامت ہے۔ پہلی صفت اَلنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ہے، یعنی سختی سے کھینچ کر نکالنے والے۔ اس سے مراد وہ عذاب کے فرشتے ہیں جو کافر کی روح نکالتے ہیں۔ دوسری صفت وَالنّٰشِطٰتِ ہے۔ یہ نَشْط سے مشتق ہے جس کے معنے بندھن کھول دینے کے ہیں۔ جس چیز میں پانی یا ہوا وغیرہ بھری ہو اس کا بندھن کھول دینے سے وہ چیز آسانی کے ساتھ نکل جاتی ہے۔ اس میں مومن کی روح نکلنے کے لیے تشبیہ ہے کہ جو فرشتے مومن کی روح قبض کرنے پر مقرر ہیں وہ آسانی سے اس کو قبض کرتے ہیں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ کافر کو وقت نزع ہی برزخ کا عذاب سامنے آجاتا ہے۔ اس سے گھبرا کر اس کی روح بدن میں چھپنا چاہتی ہے تو فرشتے اسے کھینچ کر نکالتے ہیں۔ جبکہ مومن کی روح کے سامنے عالم برزخ کی نعمتیں آتی ہیں تو اس کی روح ان کی طرف جانا چاہتی ہے۔ (معارف القرآن)

آیت نمبر (15 تا 26)

ترجمہ

هَلْ اَتٰىكَ	حَدِيْثُ مُوْسٰى ﴿۱۵﴾	اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ
کیا پہنچی آپؐ کے پاس	موسیٰؑ کی بات	جب آواز دی انؑ کو ان کے رب نے

بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ	طُوًى ﴿۱۶﴾	اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ	اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۱۷﴾
پاک کی ہوئی وادی میں	جو طوی (کہلاتی) ہے	(اور کہا کہ) آپؑ جائیں گے فرعون کی طرف	بیشک اس نے سرکشی کی

فَقُلْ	هَلْ لَّكَ اِلٰٓى	اَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۸﴾	وَاَهْدِيَكَ
پھر آپؑ کہیں	کیا تیرے لیے اس کی طرف (کوئی رجحان ہے)	کہ تو تزکیہ حاصل کرے	اور (اس طرف) کہ میں تیری رہنمائی کروں

اِلٰى رَبِّكَ	فَتَخْشٰى ﴿۱۹﴾	فَاَرٰىهُ	الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ﴿۲۰﴾
تیرے رب کی طرف	نتیجتاً تو رعب محسوس کرے (اس کا)	تو انہوںؑ نے دکھائی اس (فرعون) کو	وہ سب سے بڑی نشانی

فَكَذَّبَ وَعَصٰى ﴿۲۱﴾	ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ﴿۲۲﴾	فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿۲۳﴾
پس اس نے جھٹلایا اور نافرمانی کی	پھر اس نے پیٹھ پھیری بھاگ دوڑ کرتے ہوئے	پھر اس نے اکٹھا کیا (سب کو) تو آواز دی

فَقَالَ	اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾	فَاَخَذَهُ اللّٰهُ
پھر اس نے کہا	میں تم لوگوں کا سب سے برتر پرورش کرنے والا ہوں	تو پکڑا اس کو اللہ نے

نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾	اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ	لَعِبْرَةً	لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿۲۶﴾
دنیا اور آخرت کے عبرتناک سزا میں	بیشک اس میں	یقیناً ایک عبرت ہے	اس کے لیے جو ڈرتا ہے (رب سے)

نوٹ:1 سابقہ آیات میں عذاب قیامت کی تصویر تھی۔ اب یہ اس عذاب کی تاریخی شہادت کا حوالہ ہے جس سے رسولوں کو جھٹلانے والوں کو اس دنیا میں 6973 سابقہ پیش آیا ہے۔ اس کے لیے حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت کا انتخاب فرمایا ہے جو سب سے زیادہ مشہور معروف شہادت ہے۔ (تدبر قرآن)

نوٹ:2 حضرت موسیٰؑ کو ہدایت فرمائی گئی تھی کہ تم اور ہارون، دونوں بھائی اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے اور خدا سے ڈرے۔ (طٰہٰ۔44)۔ اس نرم کلام کا ایک نمونہ تو یہاں آیت۔18۔19۔ میں دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مبلغ کو کسی بگڑے ہوئے آدمی کی ہدایت کے لیے کس حکمت کے ساتھ تبلیغ کرنی چاہیے۔ دوسرے نمونے سورۂ طٰہٰ۔ آیت 49 تا 52، الشعراء۔23 تا 28 اور القصص۔37۔ میں دیئے گئے ہیں۔ یہ منجملہ ان آیات کے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حکمت تبلیغ کی تعلیم دی ہے۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ:3 ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ صرف بنی اسرائیل کی رہائی کے لیے ہی فرعون کے پاس نہیں بھیجے گئے تھے، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، بلکہ ان کی بعثت کا پہلا مقصد فرعون اور اس کی قوم کو راہ راست دکھانا تھا اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ اگر وہ راہ راست قبول نہ کرے تو بنی اسرائیل کو (جو اس وقت کی مسلمان قوم تھے) اس کی غلامی سے چھڑا کر مصر سے نکال لائیں۔ یہ بات ان آیات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کیوں کہ ان میں سرے سے بنی اسرائیل کی رہائی کا ذکر ہی نہیں ہے۔ بلکہ موسیٰؑ کو فرعون کے سامنے صرف حق کی تبلیغ پیش کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور ان مقامات سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے جہاں موسیٰؑ نے اسلام کی تبلیغ بھی کی ہے اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ بھی فرمایا ہے۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ:4 فرعون کا رب اعلیٰ ہونے کا دعویٰ قرآن مجید میں کئی مقامات پر بیان کیا گیا ہے، مثلاً الشعراء۔29۔ القصص۔38۔ لیکن ان باتوں سے فرعون کا یہ مطلب نہ تھا، اور نہ ہی ہوسکتا تھا، کہ وہی کائنات کا خالق ہے۔ یہ مطلب بھی نہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا منکر اور خود رب العالمین ہونے کا مدعی تھا۔ یہ مطلب بھی نہ تھا کہ وہ صرف اپنے آپ ہی کو مذہبی معنوں میں لوگوں کا معبود قرار دیتا تھا۔ قرآن مجید ہی میں اس بات کی شہادت موجود ہے کہ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے، وہ خود دوسرے معبودوں کی پرستش کرتا تھا۔ چنانچہ اس کے اہل دربار نے ایک موقع پر اس کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ کیا آپ موسیٰ اور اس کی قوم کو یہ آزادی دیتے چلے جائیں گے کہ وہ ملک میں فساد پھیلائیں اور آپ کو اور آپ کے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ الاعراف۔127۔ پس درحقیقت وہ مذہبی معنی میں نہیں بلکہ سیاسی معنی میں اپنے آپ کو الٰہ اور رب اعلیٰ کہتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اقتدار اعلیٰ کا مالک میں ہوں، میرے سوا کسی کو میری مملکت میں حکم چلانے کا حق نہیں ہے اور میرے اوپر کوئی بالاتر طاقت نہیں ہے جس کا فرمان یہاں جاری ہوسکتا ہو۔ (تفہیم القرآن)

آیت نمبر (27 تا 46)

س م ك

(ن) سَمَکَ — بلند کرنا۔ اونچا اٹھانا۔

سَمْكٌ — اسم ذات ہے۔ چھت۔ ہر اونچی چیز کا قد و قامت۔ ابھار۔ زیر مطالعہ آیت۔28۔

6973

غ ط ش

(س) غَطَشًا کمزور نظر والا ہونا۔

(افعال) اِغْطَاشًا تاریک کرنا۔ زیر مطالعہ آیت۔29۔

ذ ک ر

(ف) دَحْيًا کسی چیز کو پھیلانا۔ زیر مطالعہ آیت۔30۔

د ح ی

(ف) طَمًّا کسی کا کسی چیز کو ڈھانک لینا۔ کسی پر چھا جانا۔

طَامَّةٌ اسم الفاعل ہے۔ چھا جانے والی۔ آفت، زیر مطالعہ آیت۔34۔

ترکیب

(آیت۔27) بَنٰهَا میں فعل بَنٰی کی ضمیر مفعولی هَا۔ اَلسَّمَاءُ کے لیے ہے۔ (آیت۔28۔29) سَمْكَهَا۔ سَوّٰهَا۔ لَيْلَهَا۔ ضُحٰهَا۔ ان سب میں بھی هَا کی ضمیریں اَلسَّمَاءُ کے لیے ہیں۔ (آیت۔30) وَالْاَرْضَ کی نصب بتا رہی ہے کہ یہ فعل بَنٰی کا مفعول ہے۔ بَعْدَ ذٰلِكَ میں ذٰلِكَ کا اشارہ اَلسَّمَاءُ کی طرف مانا جاسکتا ہے اور اَلْاَرْضَ کی طرف بھی۔ اگر اَلسَّمَاءُ کی طرف مانا جائے تو مطلب ہوگا آسمان بنانے کے بعد زمین بنائی۔ اور اگر اَلْاَرْضَ کی طرف مانا جائے تو مطلب ہوگا زمین بنانے کے بعد اس کو پھیلایا۔

(آیت۔31۔32) دَحٰهَا۔ مِنْهَا۔ مَاءَهَا۔ مَرْعٰهَا۔ اَرْسٰهَا۔ ان سب میں هَا کی ضمیریں اَلْاَرْضَ کے لیے ہیں۔ فعل اَرْسٰی دو مفعولوں کا تقاضہ کرتا ہے کس کو جمایا۔ کس میں جمایا۔ یہاں اَلْجِبَالَ فعل اَرْسٰی کا مفعول مقدم اول ہے اور اس کے ساتھ هَا کی ضمیر مفعولی مفعول ثانی ہے۔

(آیت۔34۔35) فَاِذَا جَاءَتْ میں اِذَا شرطیہ ہے، اس کا جواب شرط محذوف ہے، کہ جب اَلطَّآمَّةُ الْكُبْرٰی آئے گی تو سابقہ آیات میں آسمان و زمین کی بناوٹ، سب درہم برہم ہوجائے گی۔ يَوْمَ اسی محذوف جواب شرط کا ظرف ہے۔

(آیت۔39) فَاِنَّ کا اسم اَلْجَحِيْمَ ہے اور اَلْمَاْوٰى اس کی خبر معرفہ ہے اس لیے هِیَ ضمیر فاصل آئی ہے جس سے حصر کا مفہوم پیدا ہوا ہے۔ (آیت۔43) فِيْمَ اصل میں فِيْ مَا ہے اور یہ مَا استفہامیہ ہے۔

ترجمہ

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ	خَلْقًا	اَمِ السَّمَآءُ	بَنٰهَا ﴿٢٧﴾
کیا تم لوگ زیادہ شدید ہو	بلحاظ تخلیق کرنے کے	یا یہ آسمان	اسی نے بنایا جس کو

رَفَعَ سَمْكَهَا	فَسَوّٰهَا ﴿٢٨﴾	وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا
اور اس نے بلند کیا اس کی اُٹھان کو	پھر اس نے ہموار کیا اس کو	اور اس نے تاریک کیا اس کی رات کو

وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا ﴿٢٩﴾	وَالْاَرْضَ	بَعْدَ ذٰلِكَ	دَحٰهَا ﴿٣٠﴾
اور اس نے نکالا اس کی روشنی کو	اور (اس نے بنایا) زمین کو	اس کے بعد	اس نے پھیلایا اس کو

اَخۡرَجَ مِنۡهَا مَآءَهَا	وَ مَرۡعٰهَا ﴿۳۱﴾	وَ الۡجِبَالَ اَرۡسٰهَا ﴿۳۲﴾	مَتَاعًا 6973
اس نے نکالا اس سے اس کا پانی	اور اس کا چارا	اور پہاڑوں کو اس نے جمایا اس میں	برتنے کا سامان ہوتے ہوئے

لَّکُمۡ وَ لِاَنۡعَامِکُمۡ ﴿۳۳﴾	فَاِذَا جَآءَتِ	الطَّآمَّۃُ الۡکُبۡرٰی ﴿۳۴﴾
تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے	پھر جب آئے گی	وہ سب سے بڑی چھا جانے والی (قیامت تو یہ سب درہم برہم ہو جائے گا)

یَوۡمَ یَتَذَکَّرُ الۡاِنۡسَانُ	مَا سَعٰی ﴿۳۵﴾	وَ بُرِّزَتِ الۡجَحِیۡمُ
اس دن یاد کرے گا انسان	اس کو جو اس نے دوڑ دھوپ کی	اور ظاہر کی جائے گی دوزخ

لِمَنۡ یَّرٰی ﴿۳۶﴾	فَاَمَّا مَنۡ طَغٰی ﴿۳۷﴾	وَ اٰثَرَ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا ﴿۳۸﴾
اس کے لیے جو دیکھے گا (یعنی دوزخی کے لیے)	تو وہ جو ہے جس نے سرکشی کی	اور اس نے ترجیح دی دنیوی زندگی کو

فَاِنَّ الۡجَحِیۡمَ	ہِیَ الۡمَاۡوٰی ﴿۳۹﴾	وَ اَمَّا مَنۡ خَافَ	مَقَامَ رَبِّہٖ
تو (اس کے لیے) یقیناً دوزخ	ہی ٹھکانہ ہے	اور وہ جو ہے جس نے خوف کیا	اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کے وقت کا

وَ نَہَی النَّفۡسَ	عَنِ الۡہَوٰی ﴿۴۰﴾	فَاِنَّ الۡجَنَّۃَ	ہِیَ الۡمَاۡوٰی ﴿۴۱﴾
اور اس نے روکا (اپنے) جی کو	(من کی) چاہت سے	تو (اس کے لیے) یقیناً جنت	ہی ٹھکانہ ہے

یَسۡـَٔلُوۡنَکَ	عَنِ السَّاعَۃِ	اَیَّانَ مُرۡسٰہَا ﴿۴۲﴾	فِیۡمَ اَنۡتَ
یہ لوگ پوچھتے ہیں آپؐ سے	اُس گھڑی (قیامت) کے بارے میں	کب ہے اس کے قائم ہونے کا وقت	اس میں کیا ہے آپؐ کو

مِنۡ ذِکۡرٰىہَا ﴿۴۳﴾	اِلٰی رَبِّکَ	مُنۡتَہٰىہَا ﴿۴۴﴾	اِنَّمَاۤ اَنۡتَ
اس کے ذکر میں سے	آپؐ کے رب کی طرف ہیں	اس کے ٹھہرنے کا وقت ہے	آپؐ تو بس

مُنۡذِرُ مَنۡ	یَّخۡشٰہَا ﴿۴۵﴾	کَاَنَّہُمۡ
اس کو خبردار کرنے والے ہیں جو	ڈرتا ہے اس سے	(ایسا لگے گا) جیسے کہ وہ لوگ

یَوۡمَ یَرَوۡنَہَا	لَمۡ یَلۡبَثُوۡۤا	اِلَّا عَشِیَّۃً اَوۡ ضُحٰہَا ﴿۴۶﴾
جس دن وہ دیکھیں گے اس کو،	ٹھہرے ہی نہیں	سوائے ایک شام کے یا اس کی صبح کے

نوٹ:1

سورۃ البقرہ کی آیت۔29۔اور حٰمٓ السجدہ کی آیات۔9 تا 12۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ سات آسمان زمین کی پیدائش کے بعد بنائے گئے۔ اور النّٰزِعٰت کی آیت۔30۔ سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمین آسمان کے بعد بچھائی گئی۔ اس کے جواب کئی طرح دیئے گئے ہیں۔ احقر کو ابوحیان کی تقریر پسند ہے یعنی ضروری نہیں کہ سابقہ آیات میں ثُمَّ اور زیر مطالعہ آیت میں بَعۡدَ ذٰلِکَ تراخئ زمان (زمانے کے رخ یعنی ترتیب) کے لیے ہو۔ ممکن ہے ان الفاظ سے تراخی فی الاخبار (خبروں کی ترتیب) یا تراخئ رُتبی (رتبے کی ترتیب) مراد لیں جیسے قرآن کی دوسری جگہوں میں یہ ہی معنی مراد لیے گئے ہیں۔ بہرحال قرآن کریم میں ترتیب زمانی کی ترتیب نہیں ہے۔ ہاں نعمت کے تذکرہ میں زمین کا اور

عظمت وقدرت کے تذکرہ میں آسمان کا ذکر مقدم رکھا ہے۔(ترجمہ شیخ الہندؒ۔تفسیر آیات حٰم السجدہ)

امام راغب اصفہانیؒ نے وحٰی (مادہ ''دح ی'') کے معنے کسی چیز کو اس کے مقر (جائے قرار) سے ہٹا دینے کے لکھے ہیں۔تو شاید اس لفظ میں ادھر اشارہ ہو جو آج کل کی تحقیق ہے کہ زمین اصل میں کسی بڑے جرم فلکی کا ایک حصہ ہے جو اس سے الگ ہو گیا۔واللہ اعلم۔(ترجمہ شیخ الہندؒ۔تفسیر آیت۔النّٰزعٰت)

اس کے بعد زمین کو بچھانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آسمان کے بعد زمین کو پیدا کیا۔بلکہ یہ ایسا ہی طرز بیان ہے جس میں مقصود ایک بات کے بعد دوسری بات کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے، اگرچہ دونوں ایک ساتھ پائی جاتی ہوں۔اس طرزِ بیان کی متعدد مثالیں خود قرآن میں موجود ہیں۔مثلاً سورۃ القلم۔آیت۔13 میں فرمایا عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ (جفا کار ہے اس کے بعد بد اصل ہے)۔اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے وہ جفا کار بنا اس کے بعد بد اصل بنا۔بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جفا کار ہے اور اس پر مزید یہ کہ بد اصل بھی ہے۔(تفہیم القرآن)۔قرآن میں ترتیب زمانی کے ضمن میں آیت۔2۔40،نوٹ۔1 (۳) کو بھی دوبارہ دیکھ لیں تو بات مزید واضح ہو جائے گی (مرتب)

نوٹ:2

ان آیات میں (یعنی آیت۔27 تا 33 میں) قیامت اور حیات بعد الموت کے لیے دو حیثیتوں سے استدلال کیا گیا ہے۔ایک یہ کہ اس خدا کی قدرت سے حیات بعد الموت کا برپا کرنا ہرگز بعید نہیں ہے جس نے یہ وسیع اور عظیم کائنات اس حیرت انگیز توازن کے ساتھ اور یہ زمین اس سروسامان کے ساتھ بنائی ہے۔دوسرے یہ کہ اللہ کے کمال حکمت کے جو آثار اس کائنات اور اس زمین میں صریحاً نظر آ رہے ہیں وہ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہاں کوئی کام بے مقصد نہیں ہو رہا ہے بلکہ کوئی بہت سوچا سمجھا منصوبہ اس کے پیچھے کارفرما ہے۔یہ رات اور دن کا باقاعدگی سے آنا اس بات پر گواہ ہے کہ زمین کو آباد کرنے کے لیے یہ نظم کمال درجہ دانائی سے قائم کیا گیا ہے۔خود اسی زمین میں وہ خطے بھی موجود ہیں جہاں 24 گھنٹے کے اندر رات اور دن کا الٹ پھیر ہو جاتا ہے۔اور وہ خطے بھی موجود ہیں جہاں بہت لمبے دن اور بہت لمبی راتیں ہوتی ہیں۔زمین کی آبادی کا بہت بڑا حصہ پہلی قسم کے خطوں میں اور جہاں رات اور دن جتنے زیادہ لمبے ہوتے جاتے ہیں، وہاں زندگی زیادہ سے زیادہ دشوار اور آبادی کم سے کم ہوتی چلی جاتی ہے۔یہاں تک کہ چھ مہینے کے دن اور چھ مہینے کی راتیں رکھنے والے علاقے آبادی کے بالکل قابل نہیں ہیں۔یہ دونوں نمونے اسی زمین پر دکھا کر اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کی شہادت پیش کر دی ہے کہ رات اور دن کی آمدورفت کا یہ باقاعدہ انتظام کچھ اتفاقاً نہیں ہو گیا ہے، بلکہ یہ زمین کو آبادی کے قابل بنانے کے لیے بڑی حکمت کے ساتھ ٹھیک ایک اندازے کے مطابق کیا گیا ہے۔

اسی طرح زمین کو اس طرح بچھانا کہ وہ سکونت کے قابل بن سکے۔اس میں وہ پانی پیدا کرنا جو انسان اور حیوان کے لیے پینے کے قابل اور نباتات کے لیے روئیدگی کے قابل ہو۔یہ سارے کام اس بات کی صریح علامت ہیں کہ یہ بے مقصد کام نہیں ہیں۔اب یہ ہر صاحب عقل کے سوچنے کی بات ہے کہ آخرت کا ہونا حکمت کا تقاضا ہے یا نہ ہونا؟ کیوں کہ اس سے بڑی کوئی بے مقصد بات نہیں ہو سکتی کہ اس زمین میں انسان کو تصرف کے وسیع اختیارات دے کر اسے چھوڑ دیا جائے اور کبھی اس کا محاسبہ نہ کیا جائے۔

نوٹ:3

آیات۔37 تا 41۔میں اہل دوزخ اور اہل جنت کی خاص خاص علامات کا بیان ہے جس سے ایک انسان دنیا ہی میں یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس ضابطہ کے مطابق میرا ٹھکانہ دوزخ میں ہے یا جنت میں۔ضابطہ اس لیے کہا گیا ہے کہ کسی کی شفاعت سے یا بلاواسطہ اللہ کی رحمت سے کسی جہنمی کو وہاں سے نکال کے جنت میں پہنچا دینا ایک استثنائی حکم ہے اور جنت یا دوزخ میں ٹھکانے کا اصل ضابطہ وہی ہے جو ان آیات میں بیان فرمایا ہے۔

6973
پہلے اہل جہنم کی خاص علامات بیان کی گئیں، وہ دو ہیں۔ اول طغیان یعنی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی پابندی کرنے کی بجائے سرکشی کرنا۔ دوم دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دینا۔ یعنی جب ایسا کوئی کام سامنے آئے کہ اس کے اختیار کرنے سے دنیا میں تو آرام یا لذت ملتی ہے مگر آخرت میں اس پر عذاب مقرر ہے، اس وقت وہ دنیا کی لذت کو ترجیح دے کر آخرت کی فکر کو نظر انداز کر دے۔ جو شخص دنیا میں ان دو بلاؤں میں مبتلا ہے اس کے لیے فرما دیا کہ جہنم ہی اس کا ٹھکانہ ہے۔ اس کے بعد اہل جنت کی اسی طرح دو علامتیں بتائی ہیں۔ اول یہ کہ جس شخص کو دنیا میں اپنے ہر عمل ہر کام کے وقت یہ خوف لگا رہے کہ مجھے ایک روز اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہو کر ان اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ دوم یہ کہ جس نے اپنے نفس کو قابو میں رکھا اور ناجائز خواہشوں سے اس کو روک دیا۔ جس نے دنیا میں یہ دو وصف حاصل کر لیے قرآن کریم نے اس کو یہ خوشخبری دی ہے کہ جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ عبس (80)

آیت نمبر (1 تا 23)

ترکیب

(آیات۔13 تا 16) فِیۡ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ سے پہلے فعل کُتِبَ محذوف ہے۔ اس کا نائب فاعل اس میں شامل ھُوَ کی ضمیر ہے جو تَذۡکِرَۃٌ کے لیے ہے۔ واضح رہے کہ تَذۡکِرَۃٌ مصدر ہے جو مذکر مونث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے اس سے پہلے اِنَّھَا میں اس کے لیے ھَا کی مونث ضمیر آئی ہے اور اگلی آیت میں ذَکَرَہٗ میں اسی کے لیے ہٗ کی مذکر ضمیر آئی ہے۔ صُحُفٍ جمع مکسر ہے، اس لیے اس کی صفت مُکَرَّمَۃٍ واحد مونث آئی ہے۔ آگے مَرۡفُوۡعَۃٍ اور مُطَھَّرَۃٍ بھی صُحُفٍ کی خصوصیات ہیں۔ سَفَرَۃٍ نکرہ مخصوصہ ہے۔ جبکہ کِرَامٍ اور بَرَرَۃٍ اس کی خصوصیات ہیں۔ (آیت۔23)۔ اس آیت کو گزشتہ آیت سے بھی متعلق مانا جاسکتا ہے اور اگلی آیت سے بھی اگر اس کو گزشتہ آیت سے متعلق مانا جائے تو یَقۡضِ میں شامل ھُوَ کی ضمیر فاعلی کو شَآءَ کے فاعل یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے مانا جائے گا اور اَمَرَہٗ میں ہٗ کی ضمیر کو مَا کی ضمیر عائد مانا جائے گا۔ ابن کثیرؒ نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔ (منقول از ترجمہ شیخ الہندؒ) اگر اس کو اگلی آیت سے متعلق مانا جائے تو پھر یَقۡضِ کی ضمیر فاعلی آیت۔17۔ میں اَلۡاِنۡسَانُ کے لیے مانی جائے گی اور اَمَرَہٗ کی ضمیر مفعولی بھی اُسی اَلۡاِنۡسَانُ کے لیے ہوگی۔

ترجمہ

عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤی ①	اَنۡ جَآءَہُ الۡاَعۡمٰی ؕ②	وَ مَا یُدۡرِیۡکَ
انہوںؐ نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑا	(اس لیے) کہ آئے انؐ کے پاس وہ نابینا	اور آپؐ کو کیا خبر

لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰۤی ③	اَوۡ یَذَّکَّرُ	فَتَنۡفَعَہُ	الذِّکۡرٰی ؕ④
شاید کہ وہؓ پاکیزگی حاصل کرتے	یا وہ یاددہانی حاصل کرتے	نتیجتاً نفع دیتی ان کو	وہ عظیم نصیحت (یعنی قرآن)

اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ⑤	فَاَنْتَ لَهٗ	تَصَدّٰى ⑥	وَمَا عَلَيْكَ 6973
وہ جو ہے جس نے بے پرواہی اختیار کی	تو آپؐ اس کے لیے ہی	متوجہ ہوئے	اور آپؐ پر نہیں ہے (کوئی الزام)

اَلَّا يَزَّكّٰى ⑦	وَاَمَّا مَنْ	جَآءَكَ يَسْعٰى ⑧	وَهُوَ يَخْشٰى ⑨
کہ وہ پاکیزگی حاصل نہیں کرتا	اور وہ جو ہے جو	آیا آپؐ کے پاس بھاگتا دوڑتا	اس حال میں کہ وہ ڈرتا ہے

فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ⑩	كَلَّآ اِنَّهَا	تَذْكِرَةٌ ⑪	فَمَنْ شَآءَ
تو آپؐ نے اس سے غفلت برتی	ہرگز نہیں! بیشک یہ (قرآن)	ایک یاد دہانی ہے	پس جو چاہے

ذَكَرَهٗ ⑫	فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ⑬	مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ⑭
وہ یاد رکھے اس کو	(اس کو لکھا گیا) معزز کیے ہوئے ایسے صحیفوں میں جو	بلندی دیئے ہوئے پاکیزگی دیئے ہوئے ہیں

بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ⑮	كِرَامٍ بَرَرَةٍ ⑯	قُتِلَ الْاِنْسَانُ	مَآ اَكْفَرَهٗ ⑰
کچھ ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں سے جو	بزرگی والے نیکی کرنے والے ہیں	مارا جائے انسان	کس قدر ناشکرا ہے وہ

مِنْ اَيِّ شَيْءٍ	خَلَقَهٗ ⑱	مِنْ نُّطْفَةٍ	خَلَقَهٗ	فَقَدَّرَهٗ ⑲
(سوچو تو) کس چیز سے	اس نے پیدا کیا اس کو	(پانی کی) ایک بوند سے	اس نے تخلیق کی اس کی	پھر اس نے تقدیر مقرر کی اس کی

ثُمَّ السَّبِيْلَ	يَسَّرَهٗ ⑳	ثُمَّ اَمَاتَهٗ	فَاَقْبَرَهٗ ㉑	ثُمَّ اِذَا شَآءَ
پھر راہ کو	اس نے آسان کیا اس کے لیے	پھر اس نے موت دی اس کو	تو اس نے دفن کرایا اس کو	پھر جب وہ چاہے گا

اَنْشَرَهٗ ㉒	كَلَّا	لَمَّا يَقْضِ	مَآ	اَمَرَهٗ ㉓
تو وہ دوبارہ زندہ کرے گا اس کو	ہرگز نہیں	ابھی تک اس نے پورا نہیں کیا	اس کو	جس کا اس نے حکم دیا اُسے

نوٹ:1

عَبَسَ کا فاعل یہاں مذکور نہیں ہے لیکن آگے کی آیات سے واضح ہوجاتا ہے کہ فاعل نبی ﷺ ہیں۔ اَعْمٰی سے اشارہ یہاں عبداللہ بن ام مکتومؓ کی طرف ہے۔ یہ ایک نابینا صحابی تھے۔ ایک دن نبی ﷺ قریش کے لیڈروں سے باتیں کر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا تھا۔ اسی اثنا میں عبداللہ بن ام مکتومؓ تشریف لائے اور موقع کی نزاکت کا اندازہ نہ کر سکنے کے باعث وہ بھی مجلس میں پہنچ گئے۔ ان کا یہ بے موقع آجانا حضور ﷺ کو ناگوار گزرا۔ اسی واقعہ کو جو اتفاق سے پیش آگیا۔ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو یہ تعلیم دینے کا ذریعہ بنالیا کہ آپ ﷺ اپنی توجہ کا اصل مرکز ان صحابہؓ کو بنائیں جو اپنی اصلاح اور تربیت کی طلب میں آپ ﷺ کی مجلس میں آتے ہیں اور ان لوگوں کے درپے زیادہ نہ ہوں جو بے نیاز ہیں۔ (تدبر قرآن)

اس موقع میں یہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے دو کام بیک وقت آگئے تھے۔ ایک مسلمان کی تعلیم اور اس کی دلجوئی اور دوسرے غیر مسلموں کی ہدایت کے لیے ان کی طرف توجہ۔ قرآن کریم کے اس ارشاد نے یہ واضح کر دیا کہ پہلا کام دوسرے کام پر مقدم ہے۔ دوسرے کام کی وجہ سے پہلے کام میں تاخیر کرنا یا خلل ڈالنا درست نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی تعلیم اور ان کی اصلاح کی فکر، غیر مسلموں کو اسلام میں داخل کرنے کی فکر سے اہم اور مقدم ہے۔ اس میں ایسے علماء کے لیے ایک اہم ہدایت ہے جو غیر مسلموں کو اسلام سے

مانوس کرنے کی خاطر بعض ایسے کام کر بیٹھتے ہیں جن سے مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات یا شکایات پیدا ہوجاتی ہیں۔ 6973 ان کو اس قرآنی ہدایت کے مطابق مسلمانوں کی اصلاح کو مقدم رکھنا چاہیے۔ (معارف القرآن)

نوٹ:2

آیت۔15۔ میں سَفَرَةٍ کا لفظ سَافِرٌ کی جمع بھی ہوسکتا ہے جس کے معنی کاتب کے ہیں۔ اس صورت میں اس سے مراد فرشتے، انبیاءؑ اور ان کی وحی لکھنے والے حضرات ہوں گے۔ اور یہ لفظ سَفِیْرٌ بمعنی قاصد کی جمع بھی ہوسکتا ہے۔ اس صورت میں رسل ملائکہ، انبیاءؑ اور وحی کی کتابت کرنے والے صحابہؓ کے ساتھ علماءِ اُمت بھی اس میں داخل ہوں گے، کیونکہ وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امت کے درمیان سفیر اور قاصد ہیں۔ (معارف القرآن)

نوٹ:3

آیت۔19۔ میں فَقَدَّرَهٗ کا مطلب یہ ہے کہ انسان ابھی ماں کے پیٹ میں بن رہا ہوتا ہے تو اس کے تقدیر طے کر دی جاتی ہے۔ اس کی جنس کیا ہوگی۔ اس کا رنگ، قد، جسامت وغیرہ کیسی ہوگی۔ اس کی شکل وصورت اور آواز کیسی ہوگی۔ اس کے جسم کی طاقت اور ذہنی صلاحیتیں کیا ہوں گی۔ کس سرزمین، کس خاندان اور کس ماحول میں یہ پیدا ہوگا، پرورش اور تربیت پائے گا۔ اور کتنا وقت اسے زمین میں کام کرنے کے لیے دیا جائے گا۔ اس تقدیر سے یہ بال برابر بھی ہٹ نہیں سکتا اور نہ اس میں ذرہ برابر ردوبدل کرسکتا ہے۔ (تفہیم القرآن)

تقدیر کی مذکورہ وضاحت کے حوالے سے یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ تقدیر کے اٹل ہونے کا تصور اس پہلو سے درست ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی انسان کے دائرہ اختیار کے باہر ہے۔ لیکن یہ تصور درست نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی تقدیر میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا (اعوذ باللہ من ذالك) یا نہیں کرتا۔ وہ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ہے، فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ہے۔ عام قاعدہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کی جو تقدیر مقرر کر دی ہے، اس میں وہ تبدیلی نہیں کرتا۔ لیکن جب چاہتا ہے، جس کے لیے چاہتا ہے اور جتنی چاہتا ہے تبدیلی کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تقدیر کو کوئی چیز نہیں بدل سکتی سوائے دعا کے اسی حوالے سے وہ احادیث بھی سمجھی جاسکتی ہیں جن میں عمر کے کم ہوجانے یا زیادہ ہوجانے کا ذکر ہے۔ (مرتب)

نوٹ:4

آیت۔20۔ میں راستہ کو آسان کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں وہ تمام اسباب اور وسائل فراہم کیے جن سے یہ کام لے سکے۔ ورنہ اس کے جسم اور ذہن کی ساری قوتیں بے کار ثابت ہوتیں اگر خالق نے ان کو استعمال کرنے کے لیے زمین پر یہ سروسامان مہیا نہ کر دیا ہوتا اور یہ امکانات پیدا نہ کر دیئے ہوتے۔ مزید برآں خالق نے اس کو یہ موقع بھی دیا کہ اپنے لیے خیر یا شر، شکر یا کفر، طاعت یا نافرمانی کی جو راہ بھی اختیار کرنا چاہے کر سکے۔ اس نے دونوں راستے اس کے سامنے کھول کر رکھ دیئے اور ہر راہ اس کے لیے ہموار کر دی کہ جس پر بھی چلنا چاہے چلے۔ (تفہیم القرآن)

خیر کی راہوں میں انسان کی طبعیت کو پسند نہ آنے والی چیزیں اور شر کی راہوں میں من بھاتی چیزیں تو اظہر من الشمس ہیں۔ اور ہر انسان ان راہوں کی اس ظاہری حقیقت کو خوب جانتا ہے۔ لیکن ان راہوں کا انجام اتنا ظاہر نہیں ہے اور ظاہر بین نگاہوں کی پہنچ سے باہر ہے۔ دونوں راہوں کے باطنی حقائق اور ان کے انجام کو ظاہر کرنے اور انسان کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء ورسل اور کتب کا سلسلہ قائم کیا جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت اور نزولِ قرآن سے اپنے تکمیلی مرحلہ تک پہنچ گیا۔ اب انسان کی اُخروی کامیابی کا راز اس میں ہے کہ وہ اپنی طبعیت اور اپنے موڈ کو لگام دے کر، انجام پر نظر رکھتے ہوئے زندگی کے سفر میں پیش آنے والی متبادل راہوں کا انتخاب کرتے ہوئے اپنا سفر مکمل کرے۔ اس انتخاب میں اللہ تعالیٰ کوئی مداخلت نہیں کرتا اور اس نے انسان کو اس ضمن میں مکمل خودمختاری دی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقدیر کی مجبوری

1973

کے باوجود انسان جوابدہ ہے اور جزا و سزا کا مستحق ہے۔ یہ نکتہ جن لوگوں کے سمجھ میں نہیں آتا، وہ پھر چیخ اٹھتے ہیں۔

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی
چاہے ہیں سو آپ کرے ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا

یہ درست ہے کہ انسان اپنی تقدیر کے فریم ورک کے اندر زندگی کا سفر کرنے کا پابند ہے اور اپنے فریم ورک میں بال برابر تبدیلی کرنا انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ اس کی مجبوری کا دائرہ ہے۔ اور اس فریم ورک کے اندر سفر کرتے ہوئے متبادل راہوں کے انتخاب کی اسے مکمل آزادی ہے۔ یہ اس کی خود مختاری کا دائرہ ہے۔ (مرتب)

آیت نمبر (24 تا 42)

ق ض ب

(ض) قَضْبًا — لمبے اور پھیلے ہوئے درخت اگنا۔ کاٹنا۔
قَضْبٌ — ہر وہ درخت جس کی شاخیں لمبی ہو کر لٹک جائیں۔ سبزی ترکاری۔ زیر مطالعہ آیت۔ 28۔

ء ب ب

(ض) اَبًّا — کسی کام کے لیے تیار ہونا۔
اَبٌّ — ایسی گھاس جو کٹنے کے لیے تیار ہو۔ مویشی کا چارہ۔ زیر مطالعہ آیت۔ 31۔

ص خ خ

(ن) صَخًّا — کرخت آواز کا کان کو بہرا کر دینا۔
صَاخَّةٌ — بہرا کر دینے والی چیخ۔ زیر مطالعہ۔ 33۔

ترجمہ

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ	اِلٰى طَعَامِهٖٓ ۙ﴿۲۴﴾	اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۙ﴿۲۵﴾
پس چاہیے کہ دیکھے انسان	اپنے کھانے کی طرف	بیشک ہم نے ہی برسایا پانی جیسے برساتے ہیں

ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۙ﴿۲۶﴾	فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۙ﴿۲۷﴾	وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۙ﴿۲۸﴾
پھر ہم نے پھاڑا، زمین کو جیسے پھاڑتے ہیں	تو ہم نے اگائے اس میں دانے (اناج)	اور انگور اور ترکاری

وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۙ﴿۲۹﴾	وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۙ﴿۳۰﴾	وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۙ﴿۳۱﴾
اور زیتون اور کھجوریں	اور باغات موٹے تنے والے درختوں کے	اور میوہ اور مویشی کا چارہ

مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ؕ﴿۳۲﴾	فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ۫﴿۳۳﴾
برتنے کا سامان ہوتے ہوئے تمہارے لیے اور تمہارے چوپایوں کے لیے	پھر جب آئے گی وہ کان پھاڑنے والی چیخ (نفخہ صور)

1973

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ	مِنْ أَخِيهِ ﴿٣٤﴾	وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ﴿٣٥﴾	وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ﴿٣٦﴾
جس دن بھاگیں گے سارے مرد	اپنے بھائی سے	اور اپنی ماں سے اور اپنے والد سے	اور اپنی ساتھ والی (بیوی) سے اور اپنے بیٹوں سے

لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ	يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ	يُغْنِيهِ ﴿٣٧﴾	وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مُسْفِرَةٌ ﴿٣٨﴾
ہر مرد کے لیے ان میں سے	اُس دن ایک ایسی مصروفیات (فکر) ہوگی جو	کافی ہوگی اس کو	کچھ چہرے اس دن روشن ہونے والے ہیں

ضَاحِكَةٌ مُسْتَبْشِرَةٌ ﴿٣٩﴾	وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ	عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿٤٠﴾
ہنسنے والے ہیں خوشی منانے والے ہیں	اور کچھ چہرے ہوں گے اس دن	جن پر گردوغبار ہوگا

تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿٤١﴾	أُولَٰئِكَ	هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿٤٢﴾
چھا جائے گی ان پر سیاہی	یہ لوگ	ہی ناشکری کرنے والے نافرمانی کرنے والے ہیں

نوٹ:1

انسان اپنی غذا کے مسئلہ پر ذرا غور کی نگاہ ڈالے جس پر اس کی زندگی کا انحصار ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ اس کو پیدا کرتا ہے، پھر ضروریات کی نوعیت کے لحاظ سے کتنی گوناگوں شکلوں میں اس کو پھیلا دیتا ہے۔ اگر وہ اس پر غور کرے گا اور اس کی عقل میں فتور نہیں ہے تو نہایت آسانی سے یہ نکتہ اس کی سمجھ میں آجائے گا کہ ربوبیت کا یہ وسیع نظام تقاضہ کرتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے آگے جوابدہ ہو اور اس سے پوچھا جائے کہ ان نعمتوں کا حق ادا کیا یا نہیں۔ (تدبر قرآن)

نوٹ:2

آیت۔26۔کا مطلب یہ ہے کہ ایک گھاس کے تنکے کی کیا طاقت تھی کہ وہ زمین کو چیر کر باہر نکل آتا۔ یہ قدرت کا ہاتھ ہے جو زمین کو پھاڑ کر اس سے طرح طرح کے غلے، پھل، سبزے، ترکاریاں وغیرہ نکالتا ہے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

زمین کو پھاڑنے سے مراد اس کو اس طرح پھاڑنا ہے کہ جو بیج یا گٹھلیاں وغیرہ انسان اس کے اندر بوئے یا جو کسی اور طریقے سے زمین کے اندر پہنچ جائیں، وہ اپنی کونپلیں نکال سکیں۔ انسان اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتا کہ وہ زمین میں ہل چلاتا ہے اور جو بیج خدا نے پیدا کر دیئے ہیں، انہیں وہ زمین میں اتار دیتا ہے۔ اس کے سوا سب کچھ خدا کا کام ہے۔ اسی نے بے شمار قسم کی نباتات کے بیج پیدا کیے ہیں۔ اسی نے ان بیجوں میں یہ خاصیت پیدا کی ہے کہ زمین میں پہنچ کر وہ پھوٹیں اور ہر بیج سے اس کی جنس کے نباتات اُگے۔ اور اسی نے زمین میں یہ صلاحیت پیدا کی ہے کہ پانی سے مل کر وہ ان بیجوں کو کھولے اور ہر جنس کی نباتات کے لیے اس کے مناسب حال غذا بہم پہنچا کر اسے نشوونما دے خدا نے یہ انتظام نہ کیا ہوتا تو کیا کوئی انسان کوئی بھی غذا پا سکتا تھا۔ (تفہیم القرآن)

6973

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ التکویر (81)

آیت نمبر (1 تا 14)

ك د ر

(ن) كَدَرًا گدلا ہونا، میلا ہونا۔

(انفعال) اِنْكِدَارًا کسی چیز کا بکھر کر بجھ جانا۔ بے نور ہو جانا۔ زیر مطالعہ آیت۔2۔

و ح ش

(ض) وَحْشًا انسیت نہ پانا۔ وحشت محسوس کرنا۔

وَحْشٌ ج وُحُوْشٌ۔ وہ جانور جو انسان سے مانوس نہ ہو۔ وحشی جانور۔ زیر مطالعہ آیت۔5۔

و ء د

(ض) وَأْدًا کسی کو زندہ دفن کرنا۔

مَوْئُدَۃٌ اسم المفعول کے مونث مفعولۃٌ کا وزن ہے۔ مَوْءُوْدَۃٌ کو مَوْءٗدَۃٌ لکھتے ہیں۔ زندہ دفن کی ہوئی۔ زیر مطالعہ آیت۔8۔

ك ش ط

(ض) كَشْطًا کسی چیز سے اس کا ڈھکنا اتارنا۔ کسی کی کھال اتارنا۔ آیت۔11۔

ترکیب

آیات۔1 تا 13۔ میں تمام جملے اِذَا سے شروع ہو رہے ہیں اس لیے ان میں افعال ماضی کا ترجمہ مستقبل میں ہوگا اور اِذَا کی وجہ سے یہ تمام جملے شرط ہیں، جبکہ آیت۔14۔ میں عَلِمَتْ نَفْسٌ جواب شرط ہے اس لیے عَلِمَتْ (ماضی) کا ترجمہ بھی مستقبل میں ہوگا۔ (آیت۔7) نُفُوْسٌ جمع ہے نَفْسٌ کی جس کے معنی ہیں ''سانس۔'' زندگی کا مدار سانس پر ہے اس لیے یہ جان کے لیے بھی آتا ہی اور جان والے یعنی شخص کے لیے بھی آتا ہے۔ اس لحاظ سے اس آیت کے دو طرح ترجمے کیے گئے ہیں۔ اول یہ کہ جانوں کو ان کے جسموں کے ساتھ جوڑ دیا جائے گا۔ دوم یہ کہ ہم خیال اور ایک جیسے عمل کرنے والے اشخاص کو ایک ساتھ جوڑ دیا جائے گا۔ ترجمہ میں ہم پہلی رائے کو ترجیح دیں گے۔ کیونکہ نَفْسٌ سے اگر جان مراد ہو تو یہ لفظ مونث اور اگر شخص مراد ہو تو یہ مذکر استعمال ہوتا ہے۔ اور یہاں زُوِّجَتْ مونث کا صیغہ آیا ہے اس لیے پہلی رائے کو ترجیح دی گئی ہے۔

ترجمہ

اِذَا الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ ۝١	وَاِذَا النُّجُوۡمُ انۡكَدَرَتۡ ۝٢	وَاِذَا الۡجِبَالُ سُيِّرَتۡ ۝٣
جب سورج لپیٹ دیا جائے گا	اور جب تارے بکھر کر بے نور ہو جائیں گے	اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے

وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝۴	وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝۵ 6973
اور جب حاملہ اونٹنیاں چھوڑ دی جائیں گی	اور جب وحشی جانور اکٹھا کیے جائیں گے

وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝۶	وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝۷
اور جب سمندر بھڑکائے جائیں گے	اور جب جانیں (جسموں سے) جوڑی جائیں گی

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝۸	بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝۹
اور جب زندہ دفن کی ہوئی سے پوچھا جائے گا	کس گناہ کے سبب سے وہ قتل کی گئی

وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۝۱۰	وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ۝۱۱
اور جب اوراق (اعمال نامے) کھولے جائیں گے	اور جب آسمان سے پردہ اتار لیا جائے گا

وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ۝۱۲	وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ۝۱۳	عَلِمَتْ نَفْسٌ	مَّآ اَحْضَرَتْ ۝۱۴
اور جب دوزخ بھڑکائی جائے گی	اور جب جنت نزدیک لائی جائے گی	تو جان لے گی (ہر) ایک جان	اس کو جو اس نے حاضر کیا

نوٹ:1

پچھلی دونوں سورتوں، النّٰزعٰت اور عَبَس میں جس ہولِ قیامت سے ڈرایا گیا ہے، اس سورہ میں اسی ہول قیامت کی پوری تصویر ہے۔ (تدبر قرآن)۔ پہلی آیت میں کُوِّرَتْ کا لفظ سورج کو بے نور کر دیئے جانے کے لیے ایک بے نظیر استعارہ ہے۔ عربی زبان میں تَکْوِیر کے معنی لپیٹنے کے ہیں۔ سر پر امامہ (صافہ) باندھنے کے لیے تکویر العمامہ کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ کیونکہ عمامہ پھیلا ہوا ہے اور پھر سر کے گرد اسے لپیٹا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے اس روشنی کو جو سورج سے نکل کر سارے عالم میں پھیلی ہوئی ہے، عمامہ سے تشبیہ دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ قیامت کے روز یہ پھیلا ہوا عمامہ سورج پر لپیٹ دیا جائے گا یعنی اس کی روشنی کا پھیلنا بند ہو جائے گا۔ (تفہیم القرآن)۔ ظاہر ہے کہ جب سورج کی بساط ہی لپیٹ دی جائے گی تو سارا عالم تاریک ہو جائے گا۔ اگرچہ سورج کے چھپنے کا مشاہدہ ہمیں آج بھی ہر روز ہوتا رہتا ہے لیکن اس کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ یہ صورت صرف اس وجہ سے پیش آتی ہے کہ ہم اس سے اُوٹ میں ہو جاتے ہیں۔ البتہ جب قیامت برپا ہو گی تو سورج کا سارا نظام ہی درہم برہم ہو جائے گا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے اس تاریکی کا جب کہ سرے سے سورج ہی تاریک ہو جائے گا۔ (تدبر قرآن)۔

دوسری آیت میں بتایا ہے کہ باہمی کشش ثقل کی وہ بندش جس نے اجرامِ فلکی کو اپنے اپنے مدار پر باندھ رکھا ہے وہ کھل جائے گی اور سب تارے اور سیارے کائنات میں منتشر ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ اِنْکِدَار میں کدورت کا مفہوم بھی شامل ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف منتشر ہی نہیں ہوں گے بلکہ تاریک بھی ہو جائیں گے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔4۔ میں حاملہ اونٹنی کو چھوڑ دینے کی بات عربوں کو قیامت کی سختی کا تصور دلانے کے لیے ایک بہترین طرز بیان ہے۔ موجودہ زمانے کے ٹرک اور بسیں چلنے سے پہلے اہل عرب کے لیے اس اونٹنی سے زیادہ قیمتی مال اور کوئی نہ تھا جو بچہ جننے کے قریب ہو۔ اس حالت میں اس کی بہت زیادہ حفاظت اور دیکھ بھال کی جاتی تھی۔ ایسی اونٹنیوں سے لوگوں کا غافل ہو جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس وقت کچھ ایسی سخت افتاد پڑے گی کہ انہیں اپنے عزیز ترین مال کی حفاظت کا بھی ہوش نہ رہے گا۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3

آیت۔5۔ میں وحشی جانوروں کے اکٹھا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان تو انسان، اس دن کے ہول سے وحشی جانوروں پر بھی ایسی دہشت

طاری ہوگی کہ ان کو جہاں بھی پناہ ملنے کی توقع ہوگی وہ سب وہیں اکٹھا ہوجائیں گے اور آپس کی فطری دشمنیاں بھول جائیں گے۔ جنگل میں آگ لگ جائے یا سیلاب آجائے تو جنگلی جانور جس ٹیلے پر پناہ ملے اکٹھے ہوجاتے ہیں اور اس آفت کا حول ان پر ایسا طاری ہوتا ہے کہ بکری، شیر اور بھیڑیے پاس پاس کھڑے ہوتے ہیں لیکن کسی کو ہوش نہیں رہتا کہ ان کا شکار ان کی بغل میں ہے۔ یہی صورتحال خوفناک ترین شکل میں ظہورِ قیامت کے وقت پیش آئے گی۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:4 آیت۔6۔ میں سمندر کو بھڑکائے جانے کے یہ لفظ سُجِرَتْ استعمال کیا گیا ہے جو تسجیر سے ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔ تسجیر عربی زبان میں تندور کے اندر آگ بھڑکانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ قیامت کے روز سمندروں میں آگ بھڑک اٹھے گی۔ لیکن اگر پانی کی حقیقت نگاہ میں ہو تو اس میں کوئی چیز بھی قابل تعجب نہ رہے گی۔ یہ سراسر اللہ تعالیٰ کا معجزہ ہے کہ اس نے آکسیجن اور ہائیڈروجن دو ایسی گیسوں کو باہم ملایا جن میں سے ایک آگ بھڑکانے والی اور دوسری بھڑک اٹھنے والی ہے اور ان دونوں کی ترکیب سے پانی جیسا مادہ پیدا کیا جو آگ بجھانے والا ہے۔ اللہ کی قدرت کا ایک اشارہ اس بات کے لیے کافی ہے کہ وہ پانی کی اس ترکیب کو بدل ڈالے اور یہ دونوں گیسیں ایک دوسرے سے الگ ہو کر بھڑکنے اور بھڑکانے میں مشغول ہوجائیں جو ان کی اصل بنیادی خاصیت ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:5 جاہلیت عرب میں یہ رسم تھی کہ لڑکی کو اپنے لیے موجب عار سمجھتے تھے اور اس کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ اسلام نے یہ رسم بد مٹائی۔

آیات۔8۔9۔ میں ہے کہ ایسی لڑکیوں سے پوچھا جائے گا۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قیامت تو نام ہی یوم الحساب اور یوم الجزاء کا ہے، اس میں تو ہر شخص سے اس کے تمام اعمال کے متعلق پوچھا جائے گا اس جگہ احوال قیامت کے سلسلہ میں زندہ دفن کی ہوئی لڑکی کے معاملے کو اتنی اہمیت کے ساتھ ذکر کرنے میں کیا حکمت ہے۔ غور کرنے سے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کو خود اس کے ماں باپ نے قتل کیا ہے۔ اس کے خون کا بدلہ لینے کے لیے اس کی طرف سے دعویٰ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ حشر کے میدان میں جو عدالت الٰہیہ قائم ہوگی اس میں ایسے مظالم کو بھی سامنے لایا جائے گا جس کے ظلم پر نہ کوئی شہادت ہے نہ اس مظلوم کا کوئی پرسانِ حال ہے۔

قتل اولاد گناہ کبیرہ اور ظلم عظیم ہے۔ چار ماہ کے بعد کسی حمل کو گرانا بھی اسی حکم میں ہے کیونکہ چوتھے مہینے میں حمل میں روح پڑ جاتی ہے اور وہ زندہ انسان کے حکم میں ہوتا ہے۔ اور چار ماہ سے پہلے بھی اسقاط حمل، بدون اضطراری حالات کے، حرام ہے مگر پہلی صورت کی نسبت کم ہے کیونکہ اس میں کسی زندہ انسان کا قتل نہیں ہے۔

کوئی ایسی صورت اختیار کرنا جس سے حمل قرار نہ پائے، جیسے آج کل دنیا میں ضبط تولید (فیملی پلاننگ) کے نام سے اس کی مختلف صورتیں رائج ہوگئی ہیں اس کو بھی رسول اللہ ﷺ نے وَأْدُ خفی فرمایا ہے یعنی خفیہ طور سے بچے کو دفن کر دینا۔ (مسلم، راوی حزامہ بنت وھب)۔ اور بعض دوسری روایات میں جو عزل یعنی ایسی تدبیر کرنا کہ نطفہ رحم میں نہ جائے، اس پر رسول اللہ ﷺ کی طرف سکوت یا عدم ممانعت منقول ہے وہ ضرورت کے مواقع کے ساتھ مخصوص ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ ہمیشہ کے لیے قطع نسل کی صورت نہ بنے۔ آج کل ضبط تولید کے نام سے جو دوائیں یا علاج کیے جاتے ہیں ان میں بعض ایسے بھی ہیں کہ ہمیشہ کے لیے نسل و اولاد کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے۔ اس کی کسی حال میں اجازت نہیں ہے۔ (معارف القرآن)۔

فیملی پلاننگ کی مہم کے کارکنان عزل والی حدیث کا حوالہ دیتے ہیں لیکن وَأْد خفی والی حدیث کو صاف پی جاتے ہیں۔ ایک مغرب زدہ دانشور صاحب کو میں نے اس دوسری حدیث کا حوالہ دیا تو فرمایا کہ یہ حدیث نہیں ہے کیونکہ یہ عزل والی حدیث کی ضد ہے اور اللہ

6973

کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) متضاد بات نہیں کر سکتے۔ احادیث ڈھائی سو سال کے بعد لکھی گئی ہیں اور یہ دوسری حدیث اس وقت کے کسی کٹھ ملا قسم کے تابعی نے اپنی طرف سے بڑھائی دی ہے۔ ان کے اس طرزِ عمل سے مجھے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ اول یہ کہ وَأْدُ خفی والی حدیث ان کے علم میں تھی۔ دوم یہ کہ وہ اپنی مہم کو کامیاب کرنے کی خواہش سے اس درجہ مغلوب ہو چکے ہیں کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کے دروازے انہوں نے اپنے اوپر بند کر لیے ہیں۔ ورنہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مرضی ومنشا تلاش کرنے والوں کو ان احادیث کی تطبیق میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

اس بات کو یوں سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سور کو حرام کیا ہے اور ساتھ ہی حالت اضطرار میں دو شرائط کے ساتھ سور کھانے کی رخصت بھی دی ہے۔ پہلی شرط ہے کہ سور کھاتے وقت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بغاوت کا جذبہ نہ ہو۔ دوم یہ کہ حد سے تجاوز نہ کرے یعنی اضطرار کو ختم کرنے کے لیے جتنا کھانا ضروری ہو اس سے زیادہ نہ کھائے۔ یہی صورتحال ان دونوں احادیث کی ہے کہ عمومی حکم تو یہی ہے کہ منع حمل کی تدابیر اختیار کرنا بچے کو خفیہ طور پر دفن کرنا ہے اور گناہ ہے۔ البتہ حالت اضطرار میں کسی مخصوص شخص کے لیے رخصت ہوگی لیکن وہ ہوگی انہیں دو شرائط کے ساتھ۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو صاف نظر آجاتا ہے کہ فیملی پلاننگ کے لیے ایک محکمہ قائم کرنا، وقفہ وقفہ اس کے لیے مہم چلانا، اشتہارات کی بوچھاڑ کرنا، ہر سال اس کا یوم منانا، یہ سب اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف کھلی بغاوت ہے اور حد سے تجاوز کرنا ہے۔ (مرتب)

آیت نمبر (15 تا 29)

خ ن س

(ن) خَنْسًا پیچھے ہٹنا۔ سکڑنا (لازم) پیچھے کرنا۔ سمیٹنا (متعدی)۔

خَانِسٌ ج خُنَّسٌ۔ پیچھے ہٹنے والا۔ سکڑنے والا۔ پیچھے کرنے والا۔ سمیٹنے والا۔ زیر مطالعہ آیت۔ 81/التکویر:15۔

خَنَّاسٌ فَعَّالٌ کے وزن پر مبالغہ سے۔ بار بار پیچھے ہٹنے والا۔ بار بار سکڑنے والا۔ آیت۔ 114/الناس:4۔

ك ن س

(ن) كُنُوْسًا کسی کا اپنی پناہ گاہ میں پناہ لینا۔ دبک جانا۔

كَانِسٌ ج كُنَّسٌ۔ پناہ لینے والا۔ دبک جانے والا۔ زیر مطالعہ آیت۔ 16

ض ن ن

(ض) ضَنًّا بخل کرنا۔

ضَنِيْنٌ فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ بخل کرنے والا۔ بخیل زیر مطالعہ آیت۔ 24۔

ترکیب

(آیت۔ 15 تا 18) بِالْخُنَّسِ کے حرف جَرّ بِ پر عطف ہونے کی وجہ سے اَلْجَوَارِ اور اَلْكُنَّسِ حالت جر میں ہیں۔ وَالَّيْلِ اور وَالصُّبْحِ کی واو کو قسمیہ بھی مانا جاسکتا ہے اور عاطفہ بھی مانا جاسکتا ہے۔ ایسی صورت میں اَلَّيْلِ اور اَلصُّبْحِ کی جَرّ بِ پر عطف ہونے کی وجہ سے مانی جائے گی۔ ہم انہیں واو عاطفہ مان کر ترجمہ کریں گے۔ (آیت۔ 19) اِنَّهٗ میں ہٗ کی ضمیر قرآن مجید کے لیے ہے۔ (آیت۔ 20۔ 21) ذِيْ قُوَّةٍ۔ مَكِيْنٍ۔ مُطَاعٍ اور اَمِيْنٍ، یہ سب رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ کی صفت ہونے کی وجہ سے حالت جر میں ہیں اور

یہ صفات بتارہی ہیں کہ گزشتہ آیت میں رَسُوۡلٍ کَرِیۡمٍ سے مراد حضرت جبریلؑ ہیں۔ (آیت۔23) لَقَدۡ رَاٰهُ میں فعل رَاٰی میں شامل ضمیر فاعلی هُوَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے ہے، جبکہ اس کی ضمیر مفعولی حضرت جبریلؑ کے لیے ہے۔ جبکہ آیت۔25۔ میں هُوَ کی ضمیر قرآن مجید کے لیے ہے۔ (آیت۔28) لِمَنۡ بدل ہے گزشتہ آیت میں لِلۡعٰلَمِیۡنَ کا۔ لیکن یہ بدل عام نہیں بلکہ بدل بعض ہے۔ دوسرے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ بدل مخصوصہ ہے یعنی یہ بدل ان لوگوں کے لیے ہے جن کی خصوصیت آگے بیان ہوئی ہے۔ اردو میں بھی بدل بعض کا استعمال عام ہے۔ مثلاً ہم کہتے کہ انکم ٹیکس کے قوانین میں ہونے والی تبدیلیوں کو تمام ٹیکس دہندگان، خاص طور سے تنخواہ دار طبقہ اچھی طرح سمجھ لے۔ اسی طرح سے دونوں آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید ایک یاددہانی ہے تمام جہانوں کے لیے خاص طور سے ان کے لیے جو یہ چاہتے ہیں۔

ترجمہ

فَلَآ اُقۡسِمُ	بِالۡخُنَّسِ ﴿۱۵﴾	الۡجَوَارِ
پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں	پیچھے ہٹنے والوں (یعنی ستاروں) کی	چلنے والوں (یعنی سیاروں) کی

الۡکُنَّسِ ﴿۱۶﴾	وَالَّیۡلِ اِذَا عَسۡعَسَ ﴿۱۷﴾	وَالصُّبۡحِ	اِذَا تَنَفَّسَ ﴿۱۸﴾
چھپ جانے والوں (یعنی تاروں) کی	اور رات کی جب وہ گزر جائے	اور صبح کی	جب وہ سانس لے (یعنی روشن ہو)

اِنَّهٗ	لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ کَرِیۡمٍ ﴿۱۹﴾	ذِیۡ قُوَّۃٍ	عِنۡدَ ذِی الۡعَرۡشِ مَکِیۡنٍ ﴿۲۰﴾
بیشک یہ (قرآن)	یقیناً ایک بزرگ رسول (جبریلؑ) کا قول ہے	جو قوت والا ہے	عرش والے کے پاس رتبہ والا ہے

مُّطَاعٍ	ثَمَّ	اَمِیۡنٍ ﴿۲۱﴾	وَمَا صَاحِبُکُمۡ بِمَجۡنُوۡنٍ ﴿۲۲﴾
اس کی اطاعت کی جاتی ہے	وہیں	امانتدار (بھی) ہے	اور تم لوگوں کے ساتھی مجنون نہیں ہیں

وَلَقَدۡ رَاٰهُ	بِالۡاُفُقِ الۡمُبِیۡنِ ﴿۲۳﴾	وَمَا هُوَ عَلَی الۡغَیۡبِ بِضَنِیۡنٍ ﴿۲۴﴾
اور وہ یقیناً دیکھ چکے ہیں ان (جبریلؑ) کو	کھلے آسمان کے کنارے پر	اور وہ غیب (بتانے) پر کنجوسی کرنے والے نہیں ہیں

وَمَا هُوَ	بِقَوۡلِ شَیۡطٰنٍ رَّجِیۡمٍ ﴿۲۵﴾	فَاَیۡنَ تَذۡهَبُوۡنَ ﴿۲۶﴾
اور نہیں ہے یہ (قرآن)	کسی مردود شیطان کا قول	تو تم لوگ کہاں (بھٹکنے) جاتے ہو

اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِکۡرٌ	لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۲۷﴾	لِمَنۡ شَآءَ مِنۡکُمۡ	اَنۡ یَّسۡتَقِیۡمَ ﴿۲۸﴾
نہیں ہے یہ (قرآن) مگر ایک یاددہانی	تمام جہانوں کے لیے	(خصوصاً) اس کے لیے جو چاہے تم میں سے	کہ وہ سیدھی راہ پر رہے

وَمَا تَشَآءُوۡنَ	اِلَّاۤ اَنۡ	یَّشَآءَ اللّٰهُ	رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۲۹﴾
اور تم لوگ کیا چاہوگے	سوائے اس کے کہ (جو)	چاہے گا اللہ	جو تمام جہانوں کا پالنہار ہے

نوٹ:1 آیات۔15 تا 18۔ میں جو قسمیں کھائی گئی ہیں وہ جس بات پر کھائی گئی ہے وہ آگے کی آیات میں بیان کی گئی ہیں۔ مطلب اس قسم کا یہ ہے کہ

6973

محمد ﷺ نے تاریکی میں کوئی خواب نہیں دیکھا ہے بلکہ جب تارے چھپ گئے تھے، رات رخصت ہوگئی تھی اور روشن صبح نمودار ہوگئی تھی، اس وقت کھلے آسمان پر انہوں نے خدا کے فرشتے کو دیکھا تھا۔ اس لیے وہ جو کچھ بیان کررہے ہیں وہ پورے ہوش گوش کے ساتھ دن کی روشنی میں پیش آنے والے تجربے پر مبنی ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

ان قسموں کی مناسبت آئندہ مضمون سے یہ ہے کہ ان ستاروں کا چلنا، ٹھہرنا اور چھپ جانا ایک نمونہ ہے سابقہ انبیاء پر وحی آنے، اور ایک مدت تک ان کے نشان باقی رہنے، پھر منقطع ہوکر غائب ہوجانے کا۔ اور رات کا آنا نمونہ ہے اس تاریک دور کا جو خاتم المرسلین ﷺ کی ولادت باسعادت سے پہلے دنیا پر گزرا کہ حق و باطل کی تمیز نہ رہی تھی اور وحی کے آثار بالکل مٹ چکے تھے۔ (یہ دور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع آسمانی کے بعد سے تقریباً چھ سو سال کا عرصہ ہے جب نزول وحی کا سلسلہ منقطع رہا۔ مرتب) اس کے بعد صبح کا دم بھرنا، حضور ﷺ کا اس جہاں میں تشریف لانا اور قرآن کا اترنا ہے کہ ہر چیز کو ہدایت کے نور سے دن کے مانند روشن کردیا گویا سابقہ انبیاء کا نور ستاروں کی طرح تھا اور اس نور اعظم (یعنی قرآن) کو آفتاب کہنا چاہیے۔ اور بعض علماء نے فرمایا کہ چلنا، لوٹنا اور چھپ جانا، فرشتے کے آنے، واپس جانے اور عالم ملکوت میں چھپنے کے مشابہ ہے۔ اور رات کا گزرنا اور صبح کا آنا، قرآن کے سبب سے ظلمت کفر دور ہوجانے اور نورِ ہدایت کے پوری طرح ظاہر ہوجانے کے مشابہ ہے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

نوٹ:2 آیات۔ 20۔ 21۔ میں حضرت جبریلؑ کی مزید صفات بیان کی گئی ہیں تاکہ اچھی طرح واضح ہوجائے کہ قرآن کس محفوظ و مامون اور پاکیزہ ذریعہ سے اترا ہوا کلام ہے۔ مطاع یعنی جو فرشتے ان کی ماتحتی میں ہیں وہ سب بے چوں وچرا ان کی اطاعت کرتے ہیں۔ مجال نہیں ہے کہ سر موان کے احکام سے انحراف کرسکیں، ان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھاسکیں یا ان کے دیئے ہوئے احکام میں تحریف یا ترمیم کرسکیں۔

ثَمَّ اَمِیْنٍ۔ یہاں ثُمَّ نہیں بلکہ ثَمَّ آیا ہے۔ ان دونوں کے استعمال میں فرق ہے۔ ثَمَّ کسی جگہ کی طرف خاص طور پر اشارے کے لیے بھی آتا ہے اور کسی صفت سے پہلے اس پر اہتمام سے زور دینے کے لیے بھی۔ یہاں یہ صفت امین سے پہلے آیا ہے۔ اس سے مقصود حضرت جبریلؑ کی اس صفت کی طرف خاص طور پر توجہ دلانا ہے۔ یعنی مذکورہ صفات کے ساتھ ان کی خاص اہمیت رکھنے والی صفت یہ بھی ہے کہ وہ امانتدار ہیں۔ اس صفت کا خاص اہتمام سے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی یہی صفت اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول ﷺ کے پاس جو کچھ لاتے ہیں اس میں کسی ملاوٹ یا کسی کمی بیشی کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الانفطار (82)

آیت نمبر (1 تا 8)

پ ع ث ر

(رباعی) بَعۡثَرَۃً کسی چیز کو الٹنا پلٹنا۔ کریدنا۔ اس میں سے کچھ نکالنے کے لیے۔ یُعۡثِرَ ماضی مجہول ہے۔ کریدا جانا۔ ﴿اِذَا بُعۡثِرَ مَا فِی الۡقُبُوۡرِ ۙ﴾ (100/العٰدیٰت:9) ”جب کریدا جائے گا اس کو جو قبروں میں ہے۔“

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ﴿۱﴾	وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ﴿۲﴾	وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ﴿۳﴾ 6973
جب آسمان پھٹ جائے گا	اور جب ستارے جھڑ جائیں گے	اور جب سمندر پھاڑ دیئے جائیں گے

وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ﴿۴﴾	عَلِمَتْ نَفْسٌ	مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ﴿۵﴾
اور جب قبریں ادھیڑ دی جائیں گی	تو جان لے گی ہر ایک جان اس کو	اس نے جو آگے کیا اور جو پیچھے کیا

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ	بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ﴿۶﴾	الَّذِيْ خَلَقَكَ
اے انسان کس چیز نے دھوکے میں ڈالا تجھ کو	تیرے کریم رب کے بارے میں	وہ جس نے پیدا کیا تجھ کو

فَسَوّٰكَ	فَعَدَلَكَ ﴿۷﴾	فِيْۤ اَيِّ صُوْرَةٍ	مَّا	شَآءَ	رَكَّبَكَ ﴿۸﴾
پھر اس نے نوک پلک درست کی تیری	پھر اس نے متناسب کیا تجھ کو	جس صورت میں	جو (جیسا)	اس نے چاہا	اس نے ترتیب دیا تجھ کو

نوٹ:1

ظہور قیامت کے وقت آسمان کے پھٹ جانے کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہوا۔ دراصل قیامت کے بعد ایک بالکل نیا عالم نئے قوانین کے تحت ظہور میں آئے گا، اس وجہ سے اس عالم کہن کی ہر چیز ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ اس ٹوٹ پھوٹ کی شکل کیا ہوگی، اس کا صحیح تصور آج نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کی یاد دہانی اس لیے فرمائی گئی ہے کہ لوگوں کو جھنجوڑا جائے کہ قیامت کی ہلچل ایسی ہوگی کہ یہ محکم چھت (یعنی آسمان) جس میں تم ڈھونڈے سے بھی کوئی رخنہ نہیں پا سکتے، بالکل رخنہ ہی رخنہ اور شگاف ہی شگاف بن کر رہ جائے گی۔ یہاں اس الجھن میں اپنے دماغ کو مت ڈالیئے کہ یہ آسمان جو ہمیں نظر آتا ہے، یہ محض ایک خلا ہے یا کوئی ٹھوس چیز ہے، بلکہ اس بات پر یقین رکھیں کہ جس طرح آج اس کا مشاہدہ ہم ایک محکم چھت کی شکل میں کر رہے ہیں، اسی طرح قیامت کی ہلچل کے وقت اس میں شگاف ہی شگاف نظر آئیں گے۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:2

سورۂ تکویر میں فرمایا گیا ہے کہ سمندروں میں آگ بھڑکا دی جائے گی اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ سمندروں کو پھاڑ دیا جائے گا۔ دونوں آیتوں کو ملا کر دیکھا جائے، اور یہ بات بھی نگاہ میں رکھی جائے کہ قرآن کی رو سے قیامت کے روز ایک ایسا زبردست زلزلہ آئے گا جو کسی علاقہ تک محدود نہیں ہوگا بلکہ پوری زمین بیک وقت ہلا ماری جائے گی، تو سمندروں کے پھٹنے اور ان میں آگ بھڑک اٹھنے کی کیفیت ہماری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ پہلے اس عظیم زلزلے کی وجہ سے سمندروں کی تہ پھٹ جائے گی اور ان کا پانی زمین کے اس اندرونی حصے میں اترنے لگے گا جہاں ہر وقت ایک بے انتہا گرم لاوا کھولتا رہتا ہے۔ پھر اس لاوے تک پہنچ کر پانی اپنے دو ابتدائی اجزاء کی شکل میں تحلیل ہو جائے گا جن میں سے ایک آکسیجن جلانے والی ہے اور دوسری ہائیڈروجن بھڑک اٹھنے والی ہے یوں تحلیل اور آتش افروزی کا ایک ایسا مسلسل ردعمل (Chain Reaction) شروع ہو جائے گا جس سے دنیا کے تمام سمندروں میں آگ لگ جائے گی۔ یہ ہمارا قیاس ہے باقی صحیح علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3

جب قیامت کے وہ حالات پیش آ چکیں گے جن کا ذکر شروع سورت میں کیا گیا ہے اس وقت ہر انسان جان لے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔ آگے بھیجنے سے مراد اس پر عمل کر لینا ہے اور پیچھے چھوڑنے سے مراد ترکِ عمل ہے۔ تو قیامت کے روز ہر شخص جان لے گا کہ اس نے نیک و بد کیا کیا عمل کر لیے اور نیکی و بدی میں سے کیا چھوڑ دی تھی۔ اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ آگے بھیجے ہوئے اعمال سے مراد وہ عمل

ہوں جو اس نے خود کیے، خواہ نیک ہوں یا بد، اور پیچھے چھوڑے ہوئے سے مراد وہ عمل ہوں جن کی رسم دنیا میں ڈال گئے۔ اگر وہ نیک کام ہیں تو ان کا ثواب اس کو ملتا رہے گا اور برے ہیں تو اس کی برائی اس کے نامہ اعمال میں لکھی جاتی رہے گی۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ جس شخص نے اسلام میں کوئی بھی سنت اور طریقہ جاری کرایا اس کا ثواب ہمیشہ اس کو ملتا رہے گا۔ اور جس نے کوئی بری رسم دنیا میں جاری کیا تو جب تک لوگ اس بُرے کام میں مبتلا ہوں گے اس کا گناہ اس شخص کے لیے بھی لکھا جاتا رہے گا۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:4 آیت۔6۔ کا مطلب یہ ہے کہ وہ رب کریم کیا اس کا حقدار تھا کہ اس کے حلم پر مغرور ہو کر تو نافرمانیاں کرتا رہے اور اس کے لطف و کرم کا جواب کفر وطغیان سے دے۔ اس کا کرم دیکھ کر تو اور زیادہ شرمانا اور حلیم کے غصے سے بہت زیادہ ڈرنا چاہیے تھا۔ بیشک وہ کریم ہے لیکن منتقم اور حکیم بھی ہے۔ پھر یہ دھوکا نہیں تو اور کیا ہے کہ اس کی ایک صفت کو لے کر دوسری صفات سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

اس دھوکے میں پڑنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ تیرا وجود خود بتا رہا ہے کہ تو خود نہیں بن گیا ہے، تیرے ماں باپ نے بھی تجھے نہیں بنایا ہے، عناصر کے آپ سے آپ جڑ جانے سے بھی اتفاقاً تو انسان بن کر پیدا نہیں ہو گیا ہے، بلکہ ایک خدائے حکیم و توانا نے تجھے اس مکمل انسانی شکل میں ترتیب دیا ہے۔ تیرے سامنے ہر قسم کے جانور موجود ہیں جن کے مقابلے میں تیری بہترین ساخت اور تیری افضل و اشرف قوتیں صاف نمایاں ہیں۔ عقل کا تقاضہ یہ تھا کہ اس کو دیکھ کر تیرا سر بار احسان سے جھک جاتا اور اس رب کریم کے مقابلے میں تو کبھی نافرمانی کی جرأت نہ کرتا۔ تو خود جب کسی کا افسر ہوتا ہے تو اپنے اس ماتحت کو کمینہ سمجھتا ہے جو تیرے شرافت اور نرم دلی کو کمزوری سمجھ کر تیرے سر پر چڑھ جائے۔ اس لیے تیری اپنی فطرت یہ گواہی دینے کے لیے کافی ہے کہ مالک کا کرم ہرگز اس کا موجب نہ ہونا چاہیے کہ بندہ اس کے مقابلے میں جری ہو جائے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:5 آیت۔8۔ کا مطلب یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ تخلیق سب انسانوں کی ایک خاص وضع اور ہیئت پر ہونے کی وجہ سے سب میں اشتراک ہے، اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ سب ایک ہی شکل وصورت کے ہوتے، مگر حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ نے کرڑوں بلکہ اربوں انسانوں کی شکل وصورت میں ایسے امتیازات پیدا فرما دیئے جو ایک دوسرے کے مشابہ نہیں ہوتے بلکہ صاف اور نمایاں امتیاز رہتا ہے۔ (معارف القرآن)۔

آیت نمبر (9 تا 19)

ترکیب (آیت۔10) اِنَّ کا اسم ہونے کی وجہ سے لَحٰفِظِیۡنَ حالت نصب میں ہے اس کی خبر محذوف ہے۔ عَلَیۡکُمۡ قائم مقام خبر ہے۔ لَحٰفِظِیۡنَ پر لام تاکید ہے۔ لام تاکید عموماً اِنَّ کی خبر پر آتا ہے۔ لیکن خبر محذوف ہو تو اِنَّ کے اسم پر لے آتے ہیں۔ (آیت۔ 11) کِرَامًا اور کَاتِبِیۡنَ، یہ دونوں حٰفِظِیۡنَ کا بدل ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہیں۔ (آیت۔13۔14) اَلۡاَبۡرَارَ اور اَلۡفُجَّارَ، یہ دونوں اِنَّ کے اسم ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہیں۔ ان کی خبریں محذوف ہیں۔ فِیۡ نَعِیۡمٍ اور فِیۡ جَحِیۡمٍ قائم مقام خبریں ہیں۔ جن پر لام تاکید ہے۔

ترجمہ

1973

كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۙ﴿9﴾	وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۙ﴿10﴾
ہرگز نہیں! بلکہ تم لوگ جھٹلاتے ہو بدلے (جزاوسزا) کو	اور بیشک تم لوگوں پر یقیناً محفوظ کرنے والے (مقرر) ہیں

كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۙ﴿11﴾	يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿12﴾	اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۚ﴿13﴾
جو معزز ہیں، لکھنے والے ہیں	وہ جانتے ہیں اس کو جو تم لوگ کرتے ہو	بیشک نیک لوگ یقیناً دائمی خوشحالی میں ہیں

وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ښ﴿14﴾	يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿15﴾
اور بیشک نافرمانی کرنے والے یقیناً جہنم میں ہیں	وہ لوگ کریں گے اس میں بدلے کے دن

وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَاۗىِٕبِيْنَ ﴿16﴾	وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۙ﴿17﴾
اور وہ لوگ اس (جہنم) سے چھپنے والے نہیں ہیں	اور تو کیا جانے کیا ہے بدلے کا دن

ثُمَّ	مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿18﴾	يَوْمَ لَا تَمْلِكُ	نَفْسٌ لِّنَفْسٍ
پھر (مکرر)	تو کیا جانے کیا ہے بدلے کا دن	جس دن اختیار نہ رکھے گی	کوئی جان کسی جان کے لیے

شَيْـــًٔا ۭ	وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ	لِّلّٰهِ ﴿19﴾
کسی چیز کا	اور سارے معاملات اس دن	اللہ کے لیے ہوں گے

نوٹ:1

آیت۔10۔12۔ کا مطلب یہ ہے کہ اس مغالطہ میں نہ رہنا کہ تمہاری جلوت وخلوت کی ساری باتوں سے کون باخبر ہوسکتا ہے کہ ایک دن ان کا محاسبہ کرنے بیٹھے۔ جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ہر ایک کے اوپر اپنے نگراں بیٹھا رکھے ہیں جو تمہارے ہر قول وفعل کو نوٹ کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی وہ نہایت معزز ہیں۔ ان فرشتوں کی صفت کِرَامًا، سے مقصود اس حقیقت کی یاددہانی ہے کہ یہ جس ڈیوٹی پر مامور ہیں اس کو نہایت فرض شناسی، پورے احساس ذمہ داری اور کامل غیر جانبداری کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اور جہاں کہیں بھی کرتے ہو، وہ سب ان پر واضح ہوتا ہے۔ یہاں صرف افعال کے جاننے کا ذکر ہے لیکن سورہ ق آیت۔18۔ میں فرمایا نہیں بولتا ہے وہ کوئی بات مگر ایک مستعد نگراں اس کے پاس موجود ہوتا ہے۔'' سورہ ق میں یہ وضاحت بھی ہے کہ یہ فرشتے دو ہوتے ہیں اور دائیں بائیں دونوں طرف سے نگرانی کرتے ہیں۔ احادیث سے یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ ان میں تقسیم کار ہوتی ہے۔ ایک نیکیاں لکھنے پر مامور ہوتا ہے اور دوسرا بدیاں لکھنے پر (تدبر قرآن)۔

ان فرشتوں کا مرتب کردہ ریکارڈ ایک مکمل ریکارڈ ہے جس میں درج ہونے سے کوئی بات رہ نہیں گئی ہے۔ اسی کے متعلق سورۂ کہف کی آیت۔49 میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے روز مجرمین یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ ان کا جو نامۂ اعمال پیش کیا جا رہا ہے اس میں کوئی چھوٹی یا بڑی بات درج ہونے سے رہ نہیں گئی ہے، جو کچھ انہوں نے کیا تھا سب جوں کا توں ان کے سامنے حاضر ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

1973

سورۃ المطففین (83)

آیت نمبر (1 تا 17)

ط ف ف

(ض)	طَفًّا	ہاتھ یا پاؤں سے کسی چیز کو اٹھانا۔
(تفعیل)	تَطۡفِيۡفًا	کسی چیز میں ذراسی کمی کرنا۔ پیمانہ کو تھوڑا سا کم بھرنا۔ زیر مطالعہ آیت۔1۔

ر ی ن

(ض)	رَيۡنًا	کسی کا کسی پر غالب آنا۔ چھا جانا۔ زیر مطالعہ آیت۔14۔

ترجمہ

وَيۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِيۡنَ ۝١	الَّذِيۡنَ اِذَا اكۡتَالُوۡا عَلَى النَّاسِ	يَسۡتَوۡفُوۡنَ ۝٢
تباہی ہے کمی کرنے والوں کے لیے	وہ لوگ جو جب کبھی ناپ کر لیتے ہیں لوگوں سے	تو پورا لینا چاہتے ہیں

وَاِذَا كَالُوۡهُمۡ	اَوۡ وَّزَنُوۡهُمۡ	يُخۡسِرُوۡنَ ۝٣	اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ
اور جب کبھی ناپ کر دیتے ہیں ان کو	یا تول کر دیتے ہیں ان کو	تو کمی کرتے ہیں	کیا گمان نہیں کرتے وہ لوگ

اَنَّهُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ ۝٤	لِيَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ۝٥	يَّوۡمَ يَقُوۡمُ النَّاسُ	لِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝٦
کہ وہ اٹھائے جانے والے ہیں	ایک عظیم دن کے لیے	جس دن کھڑے ہوں گے لوگ	تمام جہانوں کے رب کے سامنے

كَلَّاۤ اِنَّ كِتٰبَ الۡفُجَّارِ	لَفِىۡ سِجِّيۡنٍ ۝٧	وَمَاۤ اَدۡرٰٮكَ مَا سِجِّيۡنٌ ۝٨
ہرگز نہیں! بیشک نافرمانی کرنے والوں کی کتاب (نامہ اعمال)	یقیناً سجین میں ہے	اور تو کیا جانے کیا ہے سجین

كِتٰبٌ مَّرۡقُوۡمٌ ۝٩	وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ	لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ۝١٠	الَّذِيۡنَ يُكَذِّبُوۡنَ
(وہ) ایک لکھی ہوئی کتاب ہے	تباہی ہے اس دن	جھٹلانے والوں کے لیے	وہ لوگ جو جھٹلاتے ہیں

بِيَوۡمِ الدِّيۡنِ ۝١١	وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖۤ	اِلَّا كُلُّ مُعۡتَدٍ اَثِيۡمٍ ۝١٢
بدلے کے دن کو	اور نہیں جھٹلاتے اس کو	مگر سارے حد سے بڑھنے والے گنہگار

اِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِ اٰيٰتُنَا	قَالَ اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ ۝١٣	بَلۡ رَانَ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ
جب کبھی پڑھ کر سنائی جاتی ہے اس کو ہماری آیتیں	تو وہ کہتا ہے پہلے لوگوں کے افسانے ہیں	ہرگز نہیں! بلکہ چھا گیا ان کے دلوں پر

مَّا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ۝١٤	كَلَّاۤ اِنَّهُمۡ عَنۡ رَّبِّهِمۡ	يَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ ۝١٥
وہ جو یہ لوگ کماتے تھے	ہرگز نہیں! بیشک یہ لوگ اپنے رب سے	اس دن یقیناً روکے ہوئے ہوں گے

ثُمَّ اِنَّهُمْ	لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ؕ ۝١٦	ثُمَّ يُقَالُ	هٰذَا الَّذِىْ	كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ؕ ۝١٧
پھر بیشک یہ لوگ	یقیناً گرنے والے ہیں جہنم میں	پھر ان سے کہا جائے گا	یہ وہ ہے	تم لوگ جس کو جھٹلایا کرتے تھے

نوٹ:1 اس سورت کے انداز بیان اور مضامین سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے جب اہل مکہ کے ذہن میں آخرت کا عقیدہ بٹھانے کے لیے پے در پے سورتیں نازل ہو رہی تھیں۔ بعض مفسرین نے اس کو مدنی قرار دیا ہے۔ اس غلط فہمی کی وجہ دراصل ابن عباسؓ کی یہ روایت ہے کہ جب نبی ﷺ مدینے تشریف لائے تو یہاں کے لوگوں میں کم ناپنے اور تولنے کا مرض پھیلا ہوا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ سورہ نازل کی اور لوگ بہت اچھی طرح ناپنے تولنے لگے۔ لیکن جیسا کہ اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ صحابہ کرامؓ اور تابعین کا یہ عام طریقہ تھا کہ ایک آیت جس معاملہ میں چسپاں ہوتی ہو اس کے متعلق وہ یوں کہا کرتے تھے کہ یہ فلاں معاملہ میں نازل ہوئی۔ اس لیے ابن عباسؓ کی روایت سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جب ہجرت کے بعد نبی ﷺ نے مدینہ کے لوگوں میں یہ بری عادت پھیلی ہوئی پائی تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ ﷺ نے یہ سورت ان کو سنائی اور اس سے ان کے معاملات درست ہو گئے۔ (تفہیم القرآن۔ ج ۶ ص ۲۷۸)

نوٹ:2 مُطَفِّفِيْنَ کا لفظ تَطْفِيْف سے مشتق ہے۔ عربی میں طَفِيْف چھوٹی اور حقیر چیز کے لیے بولتے ہیں اور تطفیف کا لفظ اصطلاحاً ناپ تول میں چوری چھپے کمی کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ کام کرنے والا ناپ کر یا تول کر چیز دیتے ہوئے کوئی بڑی مقدار نہیں اڑاتا بلکہ ہاتھ کی صفائی دکھا کر ہر خریدار کے حصے سے تھوڑا تھوڑا اڑاتا رہتا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

قرآن وحدیث میں ناپ تول میں کمی کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔ کیونکہ عام طور پر معاملات کا لین دین انہی دو طریقوں سے ہوتا ہے اور انہی کے ذریعہ کہا جا سکتا ہے کہ حقدار کا حق ادا ہوا یا نہیں۔ لیکن اس سے مقصود ہر ایک حقدار کا حق پورا پورا دینا ہے اور اس میں کمی کرنا حرام ہے۔ تو معلوم ہوا کہ یہ صرف ناپ تول کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر وہ چیز جس سے حق پورا کرنا یا نہ کرنا جانچا جاتا ہے، اس کا یہی حکم ہے۔ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نماز کے رکوع سجدے وغیرہ پورے نہیں کرتا بلکہ جلدی جلدی نماز ختم کر ڈالتا ہے۔ تو اس سے فرمایا کہ تو نے اللہ کے حق میں تطفیف کر دی۔ حضرت عمرؓ کے اس قول کو نقل کر کے امام مالکؒ نے فرمایا کہ حق پورا دینا یا کم کرنا ہر چیز میں ہے، یہاں تک کہ نماز، وضو، طہارت وغیرہ میں بھی اور اسی طرح دوسرے حقوق اللہ اور عبادات میں کمی کوتاہی کرنے والا تطفیف کرنے کا مجرم ہے۔ اسی طرح حقوق العباد میں جو شخص مقررہ حق سے کم کرتا ہے وہ بھی تطفیف کے حکم میں ہے۔ ملازم نے جتنے وقت کی خدمت کا معاہدہ کیا ہے اس میں سے وقت چرانا اور چوری کرنا بھی اس میں داخل ہے۔ وقت کے اندر جس طرح محنت کرنے کا عرف میں معمول ہے اس میں سستی کرنا بھی تطفیف ہے۔ اپنی ملازمت کے فرائض میں کمی کرنے کو کوئی گناہ بھی نہیں سمجھتا۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب قوم تطفیف کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کا رزق قطع کر دیتا ہے۔ حدیث میں جو رزق قطع کر دینے کا ارشاد ہے اس کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ اس کو رزق سے بالکل محروم کر دیا جائے۔ اور یہ صورت بھی قطع رزق میں داخل ہے کہ رزق موجود ہوتے ہوئے وہ اس کو کھا نہ سکے یا استعمال نہ کر سکے جیسے بہت سے بیماریوں میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے اور اس زمانے میں بہت عام ہے۔ اسی طرح قحط کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ اشیاء ضرورت مفقود ہو جائیں اور یہ بھی ہو سکتی ہے کہ موجود ہونے کے باوجود ان کی گرانی اتنی بڑھ جائے کہ خریداری مشکل ہو جائے۔ جیسا کہ آج کل اس کا مشاہدہ اکثر چیزوں میں ہو رہا ہے۔ اس سے وہ شبہات رفع ہو جاتے ہیں جو حدیث کے الفاظ کے متعلق ظاہر حالات کے اعتبار سے ہو سکتے ہیں۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:3

معاشرے کی بے شمار خرابیوں میں سے ایک خرابی کو بطور مثال لے کر یہ بتایا گیا ہے کہ یہ آخرت سے غفلت کا لازمی نتیجہ ہے۔ 6973 جب تک لوگوں کو یہ احساس نہ ہو کہ خدا کے سامنے پیش ہونا ہے اور کوڑی کوڑی کا حساب دینا ہے، اس وقت تک یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے معاملات میں کامل راستبازی اختیار کر سکیں۔ کوئی شخص دیانتداری کو اچھی پالیسی سمجھ کر بعض چھوٹے معاملات میں دیانت برت بھی لے، تو ایسے مواقع پر وہ کبھی دیانت نہیں برت سکتا جہاں بے ایمانی ایک مفید پالیسی ثابت ہوتی ہو۔ آدمی کے اندر سچی اور مستقل دیانتداری اگر پیدا ہو سکتی ہے تو صرف آخرت پر یقین ہی سے ہو سکتی ہے، کیونکہ اس صورت میں دیانت ایک ''پالیسی'' نہیں بلکہ ''فریضہ'' قرار پاتی ہے اور آدمی کے اس پر قائم رہنے یا نہ رہنے کا انحصار دنیا میں مفید ہونے یا غیر مفید ہونے پر نہیں رہتا۔ (تفہیم القرآن۔ ج ۶۔ ص ۲۷۸۔ ۲۷۹)

نوٹ:4

آیت۔ 7۔ میں لفظ سِجِّیْنٍ آیا ہے جو سجن سے مشتق ہے جس کے معنی تنگ جگہ میں قید کرنے کے ہیں۔ اور احادیث و آثار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سجین ایک خاص مقام کا نام ہے اور کفار و فجار کی ارواح کا مقام یہی ہے اور اسی مقام پر ان کے نامۂ اعمال رہتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے اعمال نامہ اس جگہ محفوظ کر دیئے جاتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس جگہ کوئی ایسی جامع کتاب ہو جس میں تمام کفار و فجار کے اعمال لکھ دیئے جاتے ہوں۔ اس کے آگے کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ کے الفاظ آئے ہیں ان کے متعلق امام بغوی اور ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ جملہ مقام سجین کی تفسیر نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے جو کِتٰبَ الفجار آیا ہے اس کا بیان ہے۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:5

آیت۔ 14۔ میں رَانَ کا لفظ رین سے مشتق ہے جس کے معنی زنگ اور میل کچیل کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے دلوں پر ان کے گناہوں کا زنگ لگ گیا ہے اور جس طرح زنگ لوہے کو کھا کر مٹی بنا دیتا ہے اسی طرح ان کے گناہوں کے زنگ نے ان کے دل کی اس صلاحیت کو ختم کر دیا جس سے بھلے برے کی تمیز ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے۔ اگر اس نے توبہ کر لی تو یہ سیاہ نقطہ مٹ جاتا ہے اور دل اپنی اصل حالت میں منور ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس نے توبہ نہ کی بلکہ اپنے گناہوں میں زیادتی کرتا چلا گیا تو یہ سیاہی اس کے سارے قلب پر چھا جاتی ہے۔ (معارف القرآن)۔

آیت نمبر (18 تا 36)

ترجمہ

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ	لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿١٨﴾	وَمَآ اَدْرٰىكَ
ہرگز نہیں! بیشک نیکی کرنے والوں کی کتاب (اعمال نامہ)	یقیناً بلندیوں میں ہے	اور تو کیا جانے

مَا عِلِّيُّوْنَ ﴿١٩﴾	كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿٢٠﴾	يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿٢١﴾
کیا ہیں (وہ) بلندیاں	(وہ) ایک لکھی ہوئی کتاب ہے	موجود ہوتے ہیں اس پر قربت دیئے ہوئے (فرشتے)

اِنَّ الْاَبْرَارَ	لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿٢٢﴾	عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿٢٣﴾	تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ
بیشک نیکی کرنے والے	یقیناً دائمی خوشحالی میں ہوں گے	تختوں پر (بیٹھے) دیکھتے ہوئے	تو پہچانے گا ان کے چہروں میں

نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ﴿٢٤﴾	يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿٢٥﴾	خِتٰمُهٗ مِسْكٌ	وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ
دائمی خوشحالی کی تروتازگی کو	وہ پلائے جائیں گے سربمہر کی ہوئی خالص (شراب)	جس کی مہر مشک ہوگی	اور اس میں پس چاہیے کہ جان کھپائیں

اَلْمُتَنَافِسُوْنَ ۝۲۶	وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ۝۲۷	عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ۝۲۸ 6973
جان کھپانے والے	اور اس (رحیق) کی ملاوٹ تسنیم سے ہوگی	(یعنی) ایک ایسا چشمہ ہے پئیں گے جس سے قربت دیئے ہوئے

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا	كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ۝۲۹	وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ
بیشک وہ لوگ جنہوں نے جرم کیا	وہ ان سے جو ایمان لائے ہنسی ٹھٹھا کرتے تھے	اور جب گزرتے ان کے پاس سے

يَتَغَامَزُوْنَ ۝۳۰	وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ	انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ۝۳۱
تو باہم ایک دوسرے کو آنکھ مارتے	اور جب لوٹتے ہیں اپنے گھر والوں کی طرف	تو لوٹتے ہیں اکڑ باز ہوتے ہوئے

وَاِذَا رَاَوْهُمْ	قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ۝۳۲
اور جب وہ (مجرم) لوگ دیکھتے ہیں ان (اہل ایمان) کو	تو کہتے ہیں بیشک یہ لوگ یقیناً بھٹکنے والے ہیں

وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ	حٰفِظِيْنَ ۝۳۳
حالانکہ وہ (مجرم) لوگ نہیں بھیجے گئے ان (اہل ایمان) پر	نگہبانی کرنے والے ہوتے ہوئے

فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	مِنَ الْكُفَّارِ	يَضْحَكُوْنَ ۝۳۴
تو آج کے دن وہ لوگ جو ایمان لائے	انکار کرنے والوں سے	ٹھٹھا کریں گے

عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ۝۳۵	هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ	مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝۳۶
تختوں پر (بیٹھے) دیکھتے ہوئے	(تو) کیا بدلہ دے دیا گیا منکروں کو	وہ (اس کا) جو وہ کرتے تھے

نوٹ:1

تنافس کے معنی ہے کہ چند آدمیوں کا کسی خاص مرغوب و محبوب چیز کو حاصل کرنے کے لیے جھپٹنا اور دوڑنا تاکہ دوسروں سے پہلے وہ اس کو حاصل کرلیں۔ یہاں جنت کی نعمتوں کا ذکر فرمانے کے بعد حق تعالیٰ نے غفلت شعار انسان کو اس طرف متوجہ کیا ہے کہ آج تم لوگ جن چیزوں کو مرغوب و مطلوب سمجھ کر ان کو حاصل کرنے میں دوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہو، وہ ناقص اور فانی نعمتیں اس قابل نہیں کہ ان کو مقصود زندگی سمجھ کر ان کے لیے مسابقت کرو۔ بلکہ ان میں تو قناعت و ایثار سے کام لے کر یہ سمجھ لو یہ چند روزہ راحت کا سامان ہاتھ سے نکل بھی گیا تو کچھ بڑے صدمے کی بات نہیں، یہ ایسا خسارہ نہیں جس کی تلافی نہ ہو سکے۔ البتہ تنافس اور مسابقت کرنے کی چیز یہ جنت کی نعمتیں ہیں جو ہر حیثیت سے مکمل بھی ہیں اور دائمی بھی۔ (معارف القرآن)۔